قومی زبان

فاش گوئم بتو حرفے کہ نداند ہمہ کس

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان اپریل ۱۹۹۵ء جلد: ۶۷ شمارہ: ۴

مضمون نما

حکیم صاحب	نورالحسن جعفری	۱۱
خطبہ	حکیم محمد سعید دہلوی	۱۳
تھری ایچ	مختار زمن	۱۷
کہ در سفر گزرد	سحر انصاری	۲۳
حکیم صاحب	مسعود احمد برکاتی	۲۹
رباعیات اقبال کے خاص نکات	ماہ طلعت زاہدی	۳۵
اقبال ایک آفاقی شاعر	شعیب النصر	۳۹
قرۃ العین حیدر کا فن	پروفیسر شاہدہ یوسف	۴۳
لکھاری اور قاری کا رشتہ	پروفیسر اکبر حمیدی	۵۵
فاصلے دل کے	تھامس وولف/قیصر امام گیلانی	۵۹
نظم	سیموئیل بیکٹ/ادیب سہیل	۶۳
رفتار ادب	......	۶۵
کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۷۵
گردوپیش	......	۸۱
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۹۰

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۰۶ ۴۶۱۴ - ۴۹۷۳۲۹۶

جناب حکیم محمد سعید دہلوی

جناب نورالحسن جعفری (صدر انجمن ترقی اُردو) جناب حکیم محمد سعید کو انجمن کی طرف سے نشان سپاس پیش کر رہے ہیں
اس موقع پر جناب جمیل الدین عالی (معتمد اعزازی) اور جناب مختار زمن بھی موجود ہیں

جناب نورالحسن
جعفری

جناب جمیل الدین
عالی

جناب مختار زمن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جناب سحر انصاری

جناب مسعود احمد برکاتی

جناب امراؤ طارق

شرکائے جلسہ

مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیمی درسگاہ اور کتب خانے کا قیام اور علم دوستی اور کتب دوستی کی روایت قدیم دور سے چلی آتی ہے۔ عہد بنو عباس میں خلیفہ المامون کے "بیت الحکمت" کی شہرت تھی جو تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔ پھر خلیفہ "الحکم" کا دور آتا ہے۔ اُس کی علم دوستی بھی "دارالحکما" کی وجہ سے تاریخ میں سنہرے حروف سے رقم ہے۔ اسی تسلسل میں مدینتہ الحکمت کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جو اپنی تکمیل پر شہر علم وحکمت بن کر اُبھرے گا۔ فرق یہ ہے کہ بیت الحکمت اور دارالحکما کو خلیفتہ الوقت کی سرپرستی حاصل تھی اور مدینتہ الحکمت ایک ہمدرد قوم کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ جو اپنی شبانہ روز محنت اور لگن کی بدولت ہمدرد فاؤنڈیشن کے قیام میں کامیاب ہوا۔ جس کا اگلا قدم مدینتہ الحکمت ہے۔

انجمن ترقی اُردو نے انہی علم دوست یعنی جناب حکیم محمد سعید کی نصف صدی پر محیط علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شایان شان جلسہ منعقد کیا۔ جس میں مشاہیر علم وادب سے مقالے پڑھوائے گئے۔ اور اس موقع پر انجمن کی روایت کے مطابق محترم حکیم صاحب کو "نشان سپاس" پیش کیا گیا۔ اس طرح کے اعزاز سے ظاہر ہے اُنھیں اندرون ملک اور بیرون ملک اس سے پہلے بھی نوازا جاچکا ہے۔ لیکن انجمن ترقی اُردو کی اس اعزاز کی نوعیت دوسروں سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ مختلف ان معنیٰ میں کہ انجمن، علم وادب اور زبان کی ترویج کا کام بغیر کسی جزاوسزا کے 1903ء سے دیتی چلی آرہی ہے۔ قیام پاکستان میں اُردو کے محاذ پر انجمن کا کردار کسی صاحبِ علم وخبر سے ڈھکا چھپا نہیں۔ قیام پاکستان کی ساری لڑائی اِسی زبان کی وساطت سے لڑی گئی ہے جو اب پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اِس ناتے تحریک پاکستان کے زعماء کا اگر "ارباب ثلاثہ" مرتب کیا جائے تو قائداعظم اور علامہ اقبال کے ساتھ ایک نام بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا بھی آتا ہے۔

انجمن کی جانب سے تفویض کیے گئے اعزاز کو اتنی سبقت وتوقیر تو دوسرے اعزازات کے مقابلے میں ملنی ہی چاہیے جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جسے یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے وہ یہ سوچ کر اِس پر بجاطور سے خوش ہوتا ہے کہ انجمن تاریخ کے اُس بے لوث ترین فرد کی محنت شاقہ اور خون پسینہ کا عطیہ ہے جسے عرف عام میں بابائے اُردو کہا جاتا ہے۔

جناب حکیم محمد سعید دہلوی کے سلسلے میں انجمن نے پچھلے دنوں جو جلسہ منعقد کیا اُس میں پڑھے گئے مقالات، اُس کی کارروائی مع تصاویر زیر نظر قومی زبان کے صفحات پر محفوظ کردیا گیا ہے۔ حکیم صاحب محترم کی علمی وادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ اُمید ہے، قارئین کرام اِسے پسند فرمائیں گے۔

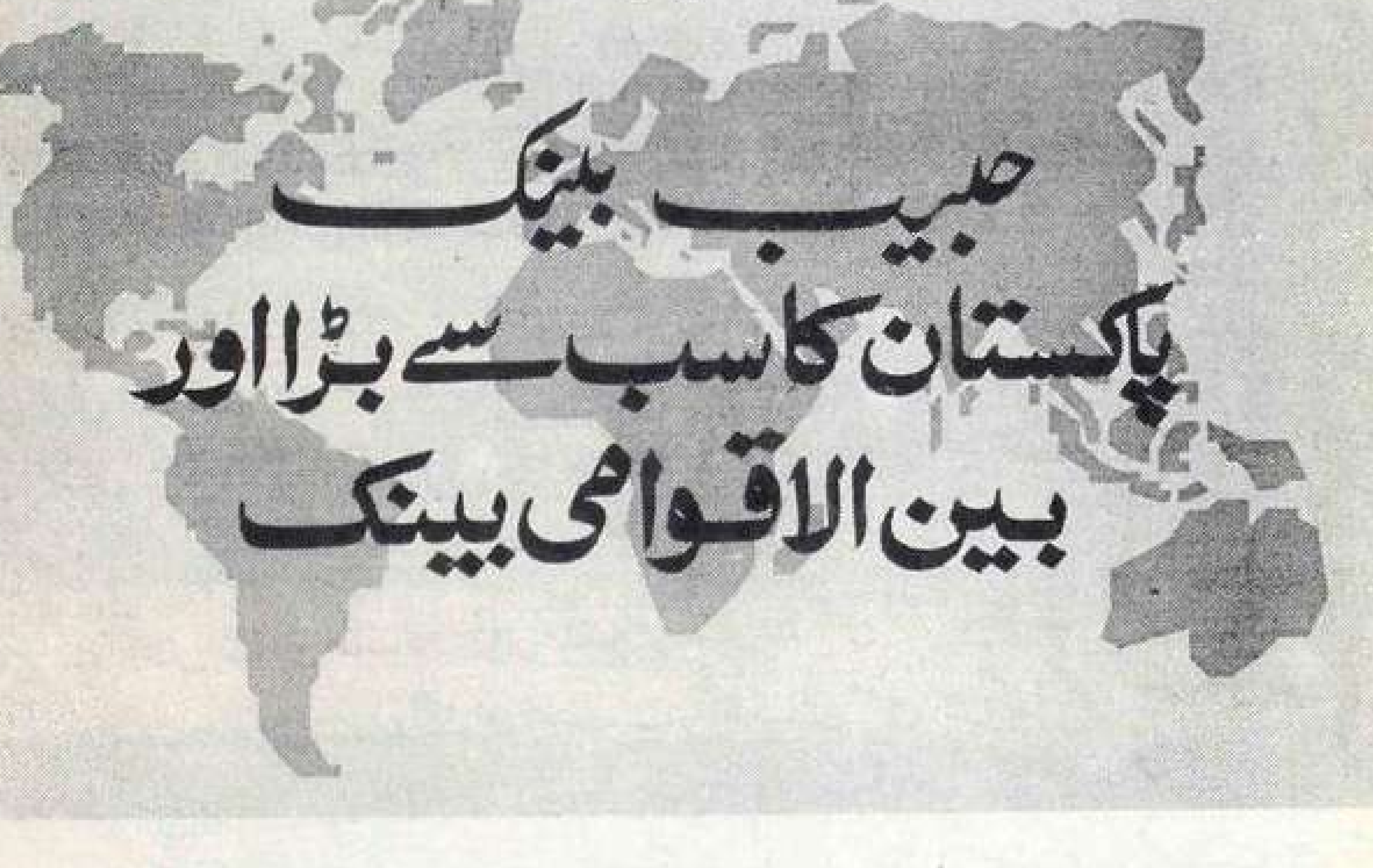

حبیب بینک، پاکستان کا عظیم ترین بینک، ہمہ گیر عالمی بینکاری خدمات پیش کرتا ہے۔ بینک جدید ترین کمپیوٹرز، آٹو ٹیلر مشینوں اور نظام ہائے مواصلات سے لیس ہے۔ حبیب بینک اپنی اندرونِ ملک ۱۸۰۰ سے زائد برانچوں اور برطانیہ، امریکہ، یورپ، مشرق بعید، جنوبی ایشاء، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور آسٹریلیا میں ۶۷ اوورسیز برانچوں کے علاوہ دنیا بھر میں ذیلی دفاتر، منیجنگ ایجنسیز، جائنٹ وینچرز آف شور بینکنگ یونٹس، نمائندہ دفاتر اور فارن کارسپونڈینٹس کے وسیع نیٹ ورک کی سہولتوں کی بدولت مشرق و مغرب کے مابین ایک اہم رابطے کے طور پر خدمات انجام دینے کی بے مثال پوزیشن میں ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

نور الحسن جعفری
صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

حکیم صاحب

جناب حکیم محمد سعید صاحب و حاضرین کرام!

کراچی آج ایک اداس اور آسیب زدہ شہر ہے اس مغموم شہر میں حکیم محمد سعید صاحب ہر ماہ "شام ہمدرد" کی شمع روشن کر کے اس کے باشندوں کے لیے روشنی کا انتظام کرتے ہیں کہ چند لمحوں ہی کے لیے یہاں کے رہنے والے اپنے دل و دماغ کو منور کر سکیں۔ گھٹن اور خوف سے عارضی نجات حاصل کر سکیں۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ وہ انجمن کی دعوت پر آج اس مجلس میں شریک ہیں اور اہالیانِ کراچی کو ایک موقع عطا کیا کہ ہم ملک و ملت اور کراچی کے باشندوں کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کر سکیں اور ان کی ذات کے حوالے سے انسانیت پر اعتبار قائم رکھ سکیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب اور جناب سحر انصاری نے حکیم صاحب کے علمی اور ادبی کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ عالی صاحب مسعود احمد برکاتی صاحب اور مختار زمن صاحب نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں اور حاضرین کرام کا بھی ممنون ہوں کہ آج شہر کے نامساعد حالات کے باوجود وہ یہاں تشریف لائے اور اس محفل کو رونق بخشی۔

میں صرف ذاتی حوالے سے حکیم صاحب کی بابت کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔ حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی جب میں شعیب صاحب وزیر خزانہ کا پرائیوٹ سکریٹری تھا۔ میں حکیم صاحب کے نام سے واقف تھا لیکن پہلی بار ان کو دیکھا اور گفتگو ہوئی۔ ہلکی سی مسکراہٹ اور نرم لہجہ وہ دن اور آج کا دن تقریباً ۳۷ سال گزرنے کے بعد بھی ان کی وہ مسکراہٹ اور نرم لہجہ قائم ہے۔ گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ان کے لطف و کرم کے روابط میرے ساتھ مضبوط تر ہوتے گئے۔

حکیم صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اس حیات مستعار کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتے ہیں۔ روزِ حساب کے قائل ہیں اور ان کو اس بات کا ادراک ہے کہ ایک دن مالک الملک کو ایک ایک لمحہ کا حساب دینا ہوگا جو امانتوں کے پاسدار ہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں انکا اجر یقینی ہے۔ وہ ایک بے حد مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ ذاتی اور سماجی روابط رکھتے ہوئے بھی وہ اپنا بیشتر وقت خدمت خلق میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں۔ مختلف شہروں میں ان کا مطب، تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں ان کی فعال شمولیت، شام ہمدرد اور "مدینتہ الحکمت" سب ان کے جذبہ خدمت کے مختلف مظاہر ہیں۔

ذاتی روابط میں مروت اور وضع داری ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے میں معتدد بار ان کے زیرِ علاج رہا ہوں۔ ابھی گزشتہ ماہ میں نے ان کو ایک خط لکھا کہ میں اپنے بھائی کو دکھلانے کے لیے ان سے وقت چاہتا ہوں ضمناً میں نے یہ بھی تذکرہ کر دیا کہ میری صحت کا بھی کچھ مسئلہ ہے جس کے لیے میں رمضان بعد ان سے رجوع کروں گا۔ ایک دن افطار سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے گھنٹی بجی اور ملازم نے خبر دی کہ حکیم صاحب باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ میں جلدی سے باہر آیا میں نے دریافت کیا کہ کیوں زحمت کی۔ انھوں نے خط کا حوالہ دیا کہ صحت بہت مقدم چیز ہے صحت کے کسی مسئلہ میں تاخیر نہیں

کرنی چاہیے وہ مجھ کو اور میرے بھائی کو دیکھنے آئے ہیں چونکہ ہمیشہ انھوں نے مجھے میرے گھر پر ہی دیکھا اس لیے کہیں اور وقت دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حکیم صاحب کی مصروفیات دیکھیے روزہ سے ہیں اور افطار سے پہلے ایک ایسے شخص کو دیکھنے کے لیے اس کے گھر پر چلے آرہے ہیں۔ جس نے معمولی ناسازی طبع کی شکایت کی ہے لیکن حکیم صاحب کی وضع داری اور خلوص کا یہی تقاضا ہے کہ وہ فوراً اُس کا علاج کریں۔ میری طرح بہت سارے اور اصحاب بھی اس مجمع میں موجود ہوں گے جن کو اس قسم کا تجربہ ہوگا۔

ایک دن لاہور ائیر پورٹ پر کراچی آتے ہوئے میں نے حکیم صاحب کو دیکھا میں بزنس کلاس میں تھا اور بورڈنگ فوراً شروع ہونے والی تھی میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں ملاقات ہو جائے گی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھا اور چاروں طرف نظر ڈالی لیکن حکیم صاحب کہیں دکھائی نہیں دیے کراچی پہنچ کر لاؤنج میں ایک ٹرالی لیے ہوئے دکھائی دیے میرے استفسار پر جواب دیا کہ وہ ہمیشہ اکانومی میں سفر کرتے ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے چیرمین عام قوانین کے مطابق ان کو بزنس کلاس کے سفر کا استحقاق ہے لیکن فاؤنڈیشن کی آمدنی کو تو وہ قوم کی امانت سمجھتے ہیں اور اپنی ذات پر وہ کم از کم رقم صرف کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان کو دیکھ کر انسانیت پر اعتبار قائم ہوتا ہے مروت اور وضع داری کے معنی معلوم ہوتے ہیں اور کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر اس بارہ کروڑ کی آبادی میں ان کی طرح کے دس انسان موجود ہوں تو اس ملک کی قسمت بدل جائے۔ حکیم صاحب کی بابت گفتگو رات بھر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت رکھے ان کو توانائی اور صحت عطا فرمائے ان کی بصیرت عام کردے ان کو اتنی مہلت عطا فرمائے کہ مدینتہ الحکمت کا کام مکمل کر سکیں۔ آمین،

ان الفاظ کے ساتھ میں ان کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

انجمن ترقی اردو پاکستان

کی

تمام مطبوعات

مکتبۂ دانیال وکٹوریہ چیمبرز۔ ۲۔ عبداللہ ہارون روڈ کراچی سے طلب فرمائیے۔

خطبہ

حکیم محمد سعید دہلوی

خواتین و حضرات

پُھولوں کے لیے کانٹوں سے اُلجھنا پڑتا ہے۔
درحقیقت زندگی عبارت ہی ہے پھول کانٹوں سے۔
فطرتِ انسانی یہ ہے کہ انسان خُوشیوں کو بہ شدّت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن غم ہائے زِندگی کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔
میری رائے ہے آپ کو اتفاق ہوگا کہ
عظیم انسان وہ ہے جو بہ ظاہر سمندر کی طرح پُرسکون رہتا ہے۔ اُس کی گہرائی میں ہزاروں تمنائیں دم توڑتی ہیں۔ خُوشیاں کرچیاں بن کر سارے جسم کو زخمی کر دیتی ہیں۔
بہ ایں ہمہ انسانِ عظیم اپنے چہرے کے گِرد مسکراہٹ کا حِصار رکھتا ہے۔
خواتین و حضرات!
اپنا حال آج ایسا ہی ہے دل بھر بھر آتا ہے!
خیال آتا ہے کہ انسان ہونا کس قدر مشکل ہے!
خواتین و حضرات!
آپ نے غور کیا ہوگا
...... بادل کا دِل بھر آتا ہے تو وہ برسات کی صورت میں رولیتا ہے۔
...... پہاڑ جب غموں کے بوجھ سے دبنے لگتے ہیں تو وہ آتش فشاں کے رُوپ میں پھٹ پڑتے ہیں۔
...... پھول غموں کی دُھوپ میں مُرجھا جاتے ہیں۔
...... ہر جان دار اور ہر بے جان شے اندر کا دکھ باہر نکال دیتی ہے۔
ہائے انسان کس قدر بے بس ہے!
...... وہ بادل نہیں کہ برس پڑے۔

......وہ پہاڑ نہیں کہ پھٹ پڑے۔
......وہ پھول نہیں کہ مرجھا جائے۔
......اُس کے دکھ اُسے گھن کی طرح کھالیتے ہیں۔
......اِن دکھوں کو سینے لگائے وہ خاموش ہو جاتا ہے۔
خواتین و حضرات!
آج کل مجھ پر خاموشی طاری ہے۔
سوچتا ہوں کہ آپ سے کیا باتیں کروں!
صاحبانِ علم و حکمت!
ابو نصر فارابی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے:
ایسے مجبور ہوئے کہ انھیں ایک نہایت کُند ذہن شخص کو پڑھانا پڑا۔ بے چارے اُکتا اُکتا جاتے، مگر پھر پڑھانے لگتے۔
آخر ایک دن اُن کے ایک دوست نے پوچھا:
آپ اس کند ذہن اور کندۂ ناتراش کو کس اُمید پر پڑھا رہے ہیں؟
فارابی نے جواب دیا:
بالکل ایسی ہی امید پر جیسے کسی حبشی کو سفید کرنے کی نیت سے نہلایا جائے۔
خواتین و حضرات!
اب آپ کو یہ سوال جناب نور الحسن جعفری صاحب سے اور ہمارے میزبان جمیل الدّین عالی صاحب سے کرنا چاہیے کہ آخر آپ کس امید پر حکیم محمد سعید کو یہ اعزازِ ادب عطا فرما رہے ہیں!
شاید وہ جواب دیں گے کہ
ہو سکتا ہے کہ چکنا گھڑا آبِ ادب سے آب دار ہو جائے!
سُست گھوڑا تیز رفتار ہو جائے!
مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو نے الیگزنڈر ڈُوما سے باتوں باتوں میں کہا:
اگر ہم دونوں کوئی ناول مل کر لکھیں تو وہ دنیا کا بہترین ناول ہوگا۔
الیگزنڈر ڈُوما نے جواب دیا:
واہ! گھوڑے اور گدھے کا کیا میل!
وکٹر ہیوگو نے ترکی بہ ترکی کہا:
بھئی تم ناول نہ لکھو، مگر گھوڑے کا خطاب تو نہ دو!
خواتین و حضرات!
یہ ہارس ٹریڈنگ کا زمانہ ہے۔
خریدار بھی زردار اور گھوڑے بھی منھ زور۔

اچھا ہے کہ اسے اب ڈنکی ٹریڈنگ کہا جانے لگے۔

ایک مرتبہ قیس بن ساعد اور اکثم بن صیفی کی ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا:
آپ نے آدمی میں کتنے عیب دیکھے؟

جواب ملا:
اتنے جن کی گنتی نہیں ہو سکتی۔ بہ ایں ہمہ
میں ایک ایسی خصلت جانتا ہوں اگر آدمی میں وہ ہو تو سارے عیب ڈھکے رہتے ہیں۔

پوچھا وہ کیا:

جواب ملا:

زبان کی حفاظت!

....

واقعہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ

سارا دن کاروبار حکومت، تھکن، آرام، سو گئے۔

بیٹا عبدالملک، جگا دیا، باہر لوگ جمع ہیں۔

تھک گیا تھا۔ ذرا سو گیا۔ لوگ انتظار کریں۔

اگر سوتے میں انتقال ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے فرائض سے غفلت کا۔

فوراً اٹھ گئے۔ عبدالملک کا ماتھا چوما۔ دعا۔ داد۔

لوگوں کے معاملات فیصلے

خواتین و حضرات!

میں انجمن ترقی اردو۔ جعفری صاحب۔ عالی صاحب کا شکریہ بیٹھنے سے پہلے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے پہلے موت آلے!

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت ہے

"تھری لیچ"

مختار زمن

گھنی بھوؤں والے اور تیر کی طرح سیدھے قد والے یہ صاحب جو سفید شروانی اور سفید جوتے پہنے آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں نہ فرشتہ ہیں اور نہ کوئی پہنچے ہوئے پیر فقیر۔ انسان ہیں اور مذہبی۔ مگر ایسے انسان جن کے قول و عمل پر پاکستان بلکہ پوری انسانیت کو فخر ہے۔ اور ایسے مذہبی کہ قُل آعوذیے نہیں مگر مذہب کی روح کو سمجھتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں خواجہ حسن نظامی نے صحیح کہا تھا کہ یہ "تھری لیچ" یعنی تین بڑی "ح" کے آدمی ہیں حافظ بھی ہیں، حاجی بھی اور حکیم بھی ...... یہ ہیں حافظ حاجی حکیم محمد سعید۔

حکیم صاحب کا یہ قول مجھے دل سے پسند ہے کہ خاندان پر فخر کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر "پدرم سلطان بود" کہہ بھی دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ خود کون ہیں؟ آپ نے کیا کارہائے نمایاں کیے ہیں؟ آپ کے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ حکیم صاحب خاندانی فخر کو عہدِ جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اسلام اس کے خلاف ہے۔ لکھتے ہیں کہ غرور نسب و خاندان ایک قابل ترک چیز ہے۔ یہ شیوۂ استخوان فروشی ہے۔ میں حکیم صاحب کی بات کو سولہ آنے پاؤرتی صحیح سمجھتا ہوں۔ مگر اس وقت ان کے خاندان کا تذکرہ کر رہا ہوں محض فخر و مباہات کے لیے نہیں بلکہ پہچان کے لیے اور جاننے کے لیے کہ وہ کس ماحول میں پلے بڑھے۔ کِس کِس پہلو پر ان کی خاندانی روایتیں اثر انداز ہوئیں۔ ان کی والدہ محترمہ یعنی "مادر ہمدرد" کے اثرات، ان کے باپ دادا کی روایات کیا تھیں اور اُنھوں نے حکیم صاحب کی کردار سازی میں کیا کردار ادا کیا۔ "بے شک اسلام نے تمام نسبتیں اور امتیازات موقوف کر دیے۔ ہر آدمی کا اور ہر عورت کا اپنا ذاتی کردار ہی اہم ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو روایت سے بغاوت کرنی پڑتی ہے۔ باپ دادا کا راستہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ اچھی روایتوں کو آگے بھی بڑھایا جاتا ہے۔ اور یہی حکیم صاحب نے کیا۔ "نذر حمید" میں مالک رام صاحب کے کہنے پر حکیم سعید صاحب نے جو خاندانی حالات لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ سترھویں صدی کی ابتدا میں حکیم صاحب کے مورث کاشغر سے پشاور آئے۔ وہ تجارت پیشہ تھے۔ پشاور میں ان کا خاندان تقریباً اسی (۸۰) سال رہا۔ تجارت خشک میووں کی تھی۔ بعض پنساری کی دکانیں چلاتے تھے۔ بعض کپڑے کی چھپائی سے گزر اوقات کرتے تھے۔ پھر ملتان آگئے جہاں تقریباً ۱۳۵ سال رہے۔ حکیم صاحب کے پردادا دہلی منتقل ہوگئے۔ اور حوض قاضی کو اپنا مسکن بنایا۔ بہادر شاہ ظفر کی بیگم زینت محل کے والد کا مکان بھی اسی علاقے میں تھا۔ وہ ڈنکا بیگم کہلاتی تھیں اس لیے کہ وہ جب لال قلعے سے اپنے گھر جاتیں تو سامنے ڈنکے والا ڈنکا بجاتا چلتا۔ غدر سے ایک برس پہلے یعنی ۱۸۵۶ء میں حکیم صاحب کے پردادا پانی پت گئے۔ اور وہیں حکیم صاحب کے دادا شیخ رحیم بخش ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ گویا اس وقت رنگون میں بہادر شاہ ظفر کو کسمپرسی کی حالت میں سوئے ہوئے دو برس گزر چکے تھے۔ انگریزی کے پنجے

ہندوستان میں گڑ چکے تھے، اور حکیم صاحب کے نانا اس کے دو برس پہلے ۱۸۶۱ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ پھر پیلی بھیت آگئے۔ یہاں حکیم صاحب کے والد بزرگوار حکیم عبدالمجید ۱۸۸۳ء اور چچا حافظ عبدالرشید ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ پیلی بھیت میں کچھ دن قیام کرکے یہ خاندان پھر دہلی آیا اور حوض قاضی میں رہنے لگا۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم صاحب یا ان کے بزرگوں نے سرکاری نوکری نہیں کی بلکہ تجارت ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ یہ بھی ایک سُنّت ہے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ لاکھوں خاندانوں کی طرح ہم بھی اُس خاندان کو بھلا دیتے اور شاید کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ کاشغر سے کوئی آیا بھی تھا یا نہیں لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ آج ہم اس خاندان کا ذکر کر رہے ہیں اور وہ ہے حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کی پیدائش۔ دونوں نے وہ نام پیدا کیا کہ خاندان کے نام کو زندہ کر دیا۔

کاشغر چین کے صوبے سینکیانگ کا ایک شہر ہے۔ میں خود سینکیانگ جا چکا ہوں۔ وہاں کے لوگ بہادر ہوتے ہیں۔ میں نے عورتوں کو سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے اور جم کر ان کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ لوگ مذہبی بھی ہیں۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ حکیم صاحب کا خاندان بھی اپنی مذہبی روایات اپنے ساتھ لے کر آیا ہوگا۔ آج تک وہی سلسلہ قایم ہے۔ حکیم صاحب کے خاندان میں حفظ قرآن تراویح میں قرآن کا سنانا۔ روزے نماز کی پابندی کوئی انہونی بات نہیں سمجھی جاتی حکیم صاحب کے والد بزرگوار کا بھی یہی دستور رہا کہ انھوں نے شعائر اسلام کی ہمیشہ پابندی کی۔ اور حکیم صاحب نے بھی ماں کی گود ہی میں وتیرہ اختیار کر لیا تھا۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں جس ماں کی گود میں عبدالحمید اور محمد سعید رہ چکے ہوں وہ کیسی بلند مرتبہ خاتون ہوں گی؟ جب حافظ عبدالمجید صاحب کھاری باؤلی دہلی جاتے اور پنساری کا کام کرتے تھے تو چلہ کشی اور درود وظایف اس وقت بھی جاری رہے۔ پھر انھوں نے حکیم اجمل خاں کے دوا خانے میں کام کیا۔ اور آخر کار "ہمدرد" کی بنیاد ڈالی۔ ابتدا حوض قاضی سے ہوئی۔ ایک چند فٹ کی دکان لی گئی۔ قلیل سرمائے سے وہ ہمدرد شروع ہوا جس کا آج پاکستان اور ہندوستان میں ڈنکہ بج رہا ہے۔ ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو حکیم عبدالمجید صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ان سب باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حکیم سعید صاحب روایتی سونے کا چمچہ منھ میں لے کر پیدا نہ ہوئے تھے۔ نہ ان کا خاندان بہت سر برآوردہ تھا نہ کوئی ان میں پنج ہزاری اور سہ ہزاری تھا۔ مگر قوت بازو، انتھک محنت اور ذہن رسا نے انھیں بلندیوں پر پہنچا دیا کام کرنے والوں کے لیے دونوں بھائیوں کی زندگی قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

حکیم سعید صاحب لکھتے ہیں کہ لڑکپن اور نوجوانی میں وہ کھلنڈرے تھے مرغ بازی، کبوتر بازی، گھوڑسواری، موٹر سائیکل دوڑانا، گلی ڈنڈا کھیلنا، کشتی رانی، شطرنج، فٹ بال، کیرم، بیڈمنٹن، تاش پہلوانی، دنگلوں میں شرکت، کسی کام میں وہ بند نہ تھے۔ مگر حکیم عبدالحمید صاحب ان کے ہمیشہ آئیڈیل رہے۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج اور بے حد محنتی انسان تھے جنھوں نے اپنی انتظامی قابلیت سے ہمدرد کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ایک دن انھوں نے حکیم سعید صاحب سے کہا!

"میاں سعید اب فیصلہ کرنے کا وقت آگیا ہے"

"محترم بھائی جان کیسا فیصلہ؟"

حکیم عبدالحمید صاحب نے جواب دیا "اب کھیلنا ہے یا مزید کچھ پڑھ لکھ کر ہمدرد کے لیے کام کرنا ہے؟"

حکیم سعید نے کہا "میں سوچ کر جواب دوں گا"

سوچا اور پھر یہ جواب دیا:

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمام کھیل کود فی الفور بند"

یہ ایک تاریخ ساز فیصلہ اور زندگی کا ایک اہم موڑ تھا حکیم سعید نے طبیہ کالج میں پڑھا علی گڑھ گئے۔ عطاری کی تربیت حاصل کی۔ دواؤں کی پیکنگ سیکھی، ہمدرد صحت کی ادارت کی۔ ہر کام میں یدِ طولیٰ حاصل کیا اور بڑے بڑوں اور تجربہ کاروں کو طاق میں بٹھا دیا مگر لکھتے ہیں کہ "ان کاموں میں اگر شکست ہوئی تو صرف بھائی جان قبلہ سے" معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی آئیڈیل ہی بننے کے لائق تھے بقول حکیم سعید وہ مشاغل پر نہایت گہرائی اور گیرائی سے غور کرتے تھے۔

دوسرا اہم فیصلہ جو حکیم سعید صاحب نے کیا وہ یہ تھا کہ ۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو ہندوستانی شہریت کو خیر باد کہا...... خیر باد تو بہت سوں نے کہا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہندوستان سے پاکستان آگئے۔ زیادہ ترلُٹ پُٹ کر بہ یک بینی و دو گوش یہاں آئے اپنے ورثے، اپنے دادا پر دادا کی قبریں چھوڑ کر اپنی جائدادیں اور خاندانی املاک ترک کر کے بعض اپنے بھائیوں کو عزیز و اقارب کو چھوڑ کر، نئے ملک کی محبت میں اور چند قسمت آزمانے یا "آپٹ" کر کے عازم پاکستان ہونے...... مگر حکیم سعید پاکستان کیوں آئے؟ ہندوستان میں وہ لالوں کے لال بنے ہوئے تھے۔ ہمدرد آب و تاب سے چل رہا تھا حکیم عبدالحمید پشت پر تھے اور ان کا سہارا بہت قیمتی سرمایہ تھا۔ حکیم سعید صاحب خود لکھتے ہیں "میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ہندوستانی حکومت کا دل سے احترام نہیں کر سکوں گا۔ لہذا میری دیانت و امانت کا یہی تقاضا ہے کہ مجھے ہندوستان میں نہیں رہنا چاہیے"...... یہ فقرہ جس خیال کی ترجمانی کر رہا ہے وہ بڑا اہم ہے یہ حکیم سعید کی ایمانداری اور سچ بولنے کی دلیل ہے...... وہ جب یہاں آئے تو روپے نہیں لاسکتے تھے۔ انھوں نے تنگ دستی میں گزر بسر کیا۔ انھوں نے کراچی کی سڑکوں پر پیدل چل کر اپنا کاروبار جمایا یہاں تک کہ ان کے جوتوں کے تلے گِھس گئے۔ آج انھیں تنگ دست کوئی نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ وہ صفِ اول میں نظر آتے ہیں مگر آج بھی ان کے پاؤں اسی زمین پر ہیں۔ اوچھے نودولتیوں کی طرح انھوں نے اپنی وضع نہیں بدلی پاکستان سے حکیم سعید کی ہمدردی، محبت اور لگاؤ بے مثال ہے۔ اسی شہر کراچی میں جگہ جگہ انھوں نے اشتہارات لگا رکھے ہیں کہ پاکستان سے محبت کرو اور اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لو۔ وہ کوئی ایسا موقع نہیں جانے دیتے جب پاکستان کے فائدے کے لیے کام نہ کریں۔ بقول راجہ صاحب محمود آباد آج حکیم سعید یہ نہیں پوچھتے کہ پاکستان نے انھیں کیا دیا بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ تم نے پاکستان کو کیا دیا۔ انھوں نے پاکستان کو اپنا سب کچھ دے ڈالا مگر اہل پاکستان بھی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے بھی حکیم صاحب کو اعلیٰ مرتبہ دیا۔ انھوں نے ہمدرد سے لاکھوں کمائے۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر وہ اپنا روپیہ عیش و عشرت میں صرف کرتے، لمبی لمبی کاروں پر گھومتے۔ اقتدار اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا۔ وہ غرور کا مجسمہ ہوتے، ان کے چاروں طرف بندوقوں اور کلاشنکوفوں سے مسلح گارڈ ہوتے اور وہ زمین پر پاؤں نہ دھرتے تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیتے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں کب روکا گیا ہے؟

لوگ تو انھیں بھی حسبِ عادت ہار پھول تک پہناتے ہیں۔ ان کی تعریفیں کرتے ہیں مگر جب وہ چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہ پُر کرنے والوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہیں...... میں سوچتا ہوں کہ پاکستان بنا کر اور ہمیں سونپ کر معمار پاکستان قائد اعظم تو چلے گئے اور یہ کہہ گئے کہ خدا نے تمھیں سب کچھ دے دیا اب یہ تمھارا فرض ہے کہ اس ملک کی ترقی کے لیے تگ و دو کرو...... مگر کتنے ہیں جنھیں یہ تاریخی بات یاد ہے اور اگر یاد ہے تو کتنے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں...... ہاں حکیم سعید ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جو اس ملک کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں پوری تن دہی اور انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ نکتہ سمجھ لیا کہ آزاد پاکستان قائد اعظم نے یوں ہی قایم نہیں کر دیا۔ یہ ملک دنیائے اسلام کی ترقی کا ضامن ہے، ان کی

آواز پر کبھی کوئی کان دھرتا ہے کبھی نہیں مگر وہ برابر اس ملک کے لیے کام کیے جاتے ہیں۔ انھیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔ حکیم صاحب کے کردار کا یہ پہلو اہم ہے کہ ہر شخص جو اپنے کو اس ملک کا شہری کہتا ہے اسے سوچنا چاہیے کہ ملک صرف تقریروں سے نہیں بنا کرتے۔ عمل سے بنا کرتے ہیں۔ تقریر تو صرف ایک جذبہ ابھارنے کے لیے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ یہ جذبہ ضروری بھی ہے۔ مگر جب آزادی مل جائے اور آپ کو اپنا مستقبل بنانے یا بگاڑنے کا اختیار دے دیا جائے تو عمل ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ ع: "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" حکیم صاحب اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہ عمل کے آدمی ہیں دن رات، انتھک جدوجہد ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ ان کے ناقدین کہتے ہیں کہ وہ خود رائے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ وہ سوچتے ہیں اور سوچ کر جس رائے پر ان کا دل دھڑکتا ہے اس پر پورے طور سے عمل کرتے ہیں۔ وہ پبلسٹی کے شوقین ہیں...... مگر پبلسٹی تو موجودہ زمانے کا کلیدی عنصر ہے ہاں پبلسٹی کے پیچھے عمل بھی ہونا چاہیے اور وہ ہے۔ ہر شے کے پیچھے ایک دنیا بسی ہوئی ہے اطبا خوش ہیں کہ طب مشرق کا احیا ہو رہا ہے۔ اہل قلم راضی ہیں کہ ان کی پذیرائی ہو رہی ہے دانشور طبقے کے لوگ پھولے نہیں سماتے کہ کوئی ان کا پوچھنے والا ہے۔ بچے کلکاریاں مار رہے ہیں کہ بڑے ان کی باتیں غور سے سنتے اور اظہار مسرت کرتے ہیں۔ مختلف شہروں میں مطب ہوتا ہے تو مریض آتے ہیں اور اپنے درد کی دوا لے جاتے ہیں۔ ایک شخص ہے جوان کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے اس شخص کا نام ہے حکیم محمد سعید...... ہاں میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ حکیم صاحب ذرا آسان زبان لکھیں تو اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔ سلاست بڑی چیز ہے۔ حکیم صاحب کا ذکر کرتے وقت ہمیں ان کی بیٹی سعدیہ کو نہیں بھولنا چاہیے۔ سعدیہ راشد منیر صاحب کی بیگم ہیں، تین بیٹیوں کی ماں ہیں ماہ نیم ماہ، آمنہ اور فاطمہ زہرہ۔ ان ناموں میں بھی مجھے حکیم صاحب کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ سعدیہ بیگم کی تربیت اس طور پر ہوئی ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود "ہمدرد" کے کاموں میں بھرپور حصہ لیتی ہیں صبح وہ ہمدرد کے دفتر جاتی ہیں اور شام کو گھر آتی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دفتر میں حکیم صاحب اُن کے لیے "حکیم صاحب" ہیں بالکل اسی طرح جیسے اوروں کے لیے وہ ہمدرد کے چیرمین ہیں دفتر میں داخل ہوتے ہی باپ بیٹی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے جیسے اوروں کے لیے۔ یہ خود چیرمین کا حکم ہے۔ لیکن گھر پر وہ باپ ہیں اور سعدیہ ان کی عزیز بیٹی۔ سعدیہ خود مجھ سے کہتی تھیں کہ حکیم صاحب سخت محنت سے کام کرتے ہیں اور اپنے عملے سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ ہنس کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ کام لینے میں وہ سخت ہیں HE IS A HARD TASK MASTER اس واقعے کو سن کو مجھے نواب بھوپال یاد آئے۔ وہ بھی پرنس عابدہ سلطان سے ہر شعبے میں کام لیتے تھے اور عملے کو حکم تھا کہ پرنس عابدہ جب حکمراں ہوں گی تو ہوں گی لیکن اس وقت تم ان سے پورا کام لو اور مزید رعایت نہ کرو......

حکیم صاحب سب سے، یاد اللہ رکھتے ہیں ان میں حکام بھی شامل ہیں اور سربراہان مملکت بھی، وہ ملنسار بھی ہیں اور خوش خلق بھی مگر موقع پڑے، تو نرم گفتار۔ حکیم سعید باجبروت حکمرانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ وہ رسان سے چلتے ہیں مگر وقت پڑے تو دلی کا یہ روڑا اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہے۔

حکیم سعید کا تازہ ترین کارنامہ مدینتہ الحکمت کا قیام ہے انھوں نے اپنے ذاتی روپے سے کئی سو ایکڑ زمین خریدی ہے ماہرین تعلیم سے مشورہ کیا۔ تعلیم و تدریس اور ایک عمدہ لائبریری کا انتظام کیا۔ وہ کراچی میں ایک مثالی ادارہ بنانا چاہتے ہیں سنتے سب کی ہیں۔ کرتے وہی ہیں جو مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بڑی اسکیم کی شروعات ہے۔ ابھی تو یہ منصوبہ ابتدائی مراحل میں ہے جب پورا ہو جائے گا تو صف اوّل میں شمار ہوگا جس سے پورے ملک کو فائدہ پہنچے گا یہ مضافات کراچی میں واقع ہے۔ مگر کراچی پر

آج کل بُرا وقت پڑا ہے۔ قتل کی وارداتیں روز کا معمول ہیں۔ گاڑیوں کا چھن جانا، معصوم لوگوں کا مارا جانا، غارت گری، کراچی کی تقسیم، ملک پر غیروں کی حریصانہ نگاہ، ایسی باتیں ہیں جن سے لوگوں پر اور خصوصاً اُن پر جو پاکستان کی تحریک میں شریک تھے وہ اس ملک سے بڑی آس لگائے تھے مگر آج غم کے پہاڑ کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی پکڑنے والا نہیں، سنگ رابستہ سگ راکشادہ۔ ایسے میں حکیم صاحب جو ملک میں اس لیے آئے تھے کہ یہاں ایک آزاد اسلامی سلطنت ہوگی ضرور دم بخود ہوں گے...... مگر آفرین ہے اُن پر کہ وہ برابر اس ملک کے لیے کام کیے جا رہے ہیں اس امید پر کہ:

کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

میں حکیم صاحب کو ان کی پامردی کی داد دیتا ہوں وہی اس ملک اور خصوصاً اس شہر کی ناک ہیں، آبرو ہیں، سہارا ہیں خدا اس شہر کو اور اس ملک کو جیتا رکھے کہ ہم جیسے ہزاروں لوگ ان کے ان ہی جیسے لوگوں کے بل بوتے پر جیتے ہیں رعنائی خیال اسی شخص کے تصور سے ہے جسے حکیم محمد سعید کہتے ہیں۔

الف لیلہ و لیلہ

مترجمہ: ڈاکٹر ابوالمنصور احمد

جلد اوّل تا ہفتم: قیمت = /۸۹۰

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی ۱۵۹- بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

کہ در سفر گزرد

(حکیم محمد سعید کے چند سفر ناموں کا جائزہ)

سحر انصاری

تہذیب انسانی کے جملہ مظاہر اپنی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی تشکیل و تعمیر کے پس منظر میں ایک طویل تاریخ ملتی ہے۔ یہ تاریخ جتنی طویل ہوگی اتنا ہی تہذیبی اقدار کا استحکام معتبر ہوتا چلا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں تہذیب کے حوالے سے بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن تہذیب کا ایک رُخ وہ بھی ہے جسے برصغیر میں مشرقی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسے عبدالحلیم شرر نے مشرقی تمدن کے آخری نمونے میں ناصر نذیر فراق نے لال قلعے کی ایک جھلک میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تہذیب کو اپنے ایک خاص تاریخی مرحلے میں اُس کشمکش اور شکست و ریخت کی اس منطق سے گزرنا پڑا جسے غالب نے اپنے اس شعر میں ظاہر کیا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس کشمکش کا مرکز ثقل دہلی تھا۔ جو دارالحکومت اور مغل شہنشاہیت کے آخری تاجدار کی بنا پر اس: "رستِ خیزے بے جا" سے لاتعلق رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت چند اذہان نے ہر قیمت پر اس تہذیب اور فکر کو اپنائے رکھنے کی کوشش کی جسے تہذیبِ مشرق اور فکرِ مشرق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حکیم محمد سعید انھی اذہان کے زیر سایہ پروان چڑھے اور جب خود آگہی و دانش پختگی اور انفرادی غور و خوض کے مراحل میں آئے تو انھوں نے اپنے لیے انفرادی اور اجتماعی شناخت کے لیے "مشرق" ہی کا افسوں اختیار کیا۔ انھوں نے قدرتی طور پر سب سے پہلے اپنے فن اور عمل یعنی طب کو طبِ مشرق کا نام دیا۔ اپنے ادارے کے شربت کو مشروبِ مشرق قرار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ اپنی عالمگیر مقبولیت کے باعث مشروبِ مشرق و مغرب بن گیا ہے۔

خود حکیم محمد سعید بھی مشرق کی شناخت اور تہذیب مشرق کا مجسمہ ہونے کے باوجود مشرق و مغرب کا بہترین امتزاج ہیں۔ مشرق ان کے ظاہر کی تشکیل کرتا ہے اور ان کے باطن میں مشرق و مغرب کے بہترین صفات نے جگہ پالی ہے۔

مشرق کو حکیم محمد سعید نے اپنی روایتوں، نسبتوں اور تجربوں سے دیکھا، سیکھا، پرکھا اور اپنایا۔ مغرب کو انھوں نے پہلے کتابوں کے ذریعے اور پھر سفر و سیاحت کی راہ سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی اور وہ تمام جواہر اخذ کر لیے جنھیں مومن کی گمشدہ

میراث کہا گیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ جتنا زیادہ مغربی اور ترقی یافتہ ممالک میں جاتے رہے، ان کی چمک دمک سے مرعوب ہونے کے بجائے ایک باشعور انسان کی طرح اُن کی خیروشر اور نیک و بد کو تنقیدی نظر سے پرکھتے رہے اور منطق واستدال کے ذریعے مشرق کی خوبیوں کو سب پر حاوی پاتے رہے۔

حکیم محمد سعید کی اِس نمایاں خوبی اور مستحکم صفت کا مسلسل احساس و اندازہ اگر ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ کسی صنف سے ہوا ہے تو وہ اُن کے سفر نامے ہیں۔ اور اس وقت میں اُن کے سفر ناموں ہی کے تعلق سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حکیم محمد سعید نے برصغیر سے باہر کے لیے سب سے پہلا سفر ۱۹۲۷ء میں کیا تھا۔ اس میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ پھر ۱۹۴۸ء میں مصر، ۱۹۵۲ء میں انڈونیشیا اور اس کے دیگر ہمسایہ ممالک کا سفر کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حکیم صاحب نے یورپ کے بعض ممالک کا سفر کیا۔ یہ طویل سفر تین ماہ کی مدت پر محیط ہے۔ حکیم صاحب کو روزانہ ڈائری لکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ روزنامچے کی روشنی میں سفر کے حالات کو کسی کتاب میں ڈھال دینا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حکیم صاحب اس قدر مصروف زندگی گزارنے کے باوجود اچھی خاصی تعداد میں سفر نامے قلمبند کر چکے ہیں۔ اور یہ صنفِ ادب انھیں اس قدر عزیز ہے کہ سعید سیاح کے زیر عنوان انھوں نے نونہالوں کے لیے بھی سفر ناموں کا ایک پورا سلسلہ تحریر کر دیا ہے جو اُن کے بڑے اور طویل سفر ناموں سے الگ نوعیت رکھتے ہیں۔

حکیم محمد سعید کا یورپ نامہ ۱۹۶۰ء میں جرمنی نامہ ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا۔ ان کے بعد شب روز، ماہ و روز، ماہِ سعید، ماوراء السجار، ریگ رواں، کوریا کہانی، درون روس اور ایک مسافر چار ملک، بطور خاص قابلِ ذکر ہیں چین کے بارے میں بھی حکیم صاحب کی ایک علاحدہ تصنیف موجود ہے۔

سفر نامے ہر دور میں لکھے گئے اور تاریخ کا حصّہ بنتے رہے۔ اہلِ یونان و روما کے سفر ناموں کے بعد، قدیم چین کے سیاحوں کی تحریریں آتی ہیں، ۔ مارکوپولو کا سفر نامہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح سفر نامہ ابنِ بطوطہ سفر نامہ جبیر اندلسی سفر نامہ ناصر خسرو کو ہمارے یہاں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاہجہاں کے زمانے میں کچھ عرصہ قیام کر کے واپس جانے والے سیاحوں میں بر نیر اور منوچی کے سفر نامے بطور خاص اہم ہیں۔ یہاں سفر ناموں کی تاریخ دہرانا مقصود نہیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ سفر نامہ نگاری، سیاحت نویسی ایک پسندیدہ مشغلہ رہا ہے اور ہر عہد میں ان تحریروں کو شوق سے پڑھا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی کے سفر ناموں میں مقصدیت، معلومات اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت کو زیادہ مقام دیا گیا ہے۔ یہ سفر نامے تفریح یا وقت گزاری کے مشغلے کے طور پر نہ لکھے گئے اور نہ انھیں اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ حکیم محمد سعید کے سفر نامے اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

جدید دور میں بھی سفر نامے بہت لکھے اور پسند کیے جا رہے ہیں لیکن ان بیشتر کو فکشن کے اسلوب و اظہار کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مصنفوں کا کہنا یہ ہے کہ ممالک عالم کے بارے میں جغرافیائی، تاریخی اور حقیقی معلومات تو آپ انسائیکلو پیڈیا اور محکمہ اطلاعات کے لٹریچر سے بھی حاصل کر سکتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ ان ممالک کی سیر کے دوران خود آپ کس کس تجربے سے گزرے۔ چنانچہ اب سفر ناموں کا بھی ایک فارمولا بن چکا ہے۔ سفر نامے کا ہیرو اپنی صفاتِ عزم و شجاعت میں سند باد جہازی تو ہوتا ہی ہے لیکن حسن و جمال میں یوسفِ ثانی سے ذرّہ بھر بھی کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ دنیا جہاں کی حسینائیں اس کو رجھانے اور اس پر فریفتہ ہونے کا وہ نقشہ پیش کرتی ہیں جو ہومر کی اوڈیسی اور سائرن کی عشوہ طرازیوں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس میں

دنیا بھر کے لطیفے، حاضر جوابی اور بزلہ سنجی کے نمونے اپنے نام اور اپنی SITUATION کے حوالے سے پیش کر دیے جاتے ہیں تاکہ تحریر دلچسپ، پُر مزاح اور شگفتہ ہو جائے۔ ایسے فارمولا ٹائپ سفر نامے پڑھ کر تو بعض اوقات یہ خیال آتا ہے کہ ایسے سفر نامے لکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اردو اور انگریزی میں "سفر" بھی کریں۔ بس

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اور ایک عدد سفر نامہ تیار۔

حکیم محمد سعید کے سفر نامے اس بھیڑ چال سے مختلف ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ حکیم صاحب کی زندگی ایک مقصد اور ایک نصب العین کی حامل ہے۔ اور اس کا بنیادی نکتہ شخصیت اور ملت کی انفرادی اور اجتماعی سطح پر تشکیل و تعمیر کرنا ہے تاکہ فرد BEING سے Becoming کے عمل میں۔ آدمی سے انسان بن سکے۔ کیونکہ فی الحال گرد و پیش کا عالم تو یہی ہے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حکیم محمد سعید کی تحریروں کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، طب مذہب، اخلاقیات، تہذیب و تمدن، سیاست، حکمت و فلسفہ ادبی و سماجی صحافت وغیرہ لیکن ان کی بعض تحریریں خالص ادب کے ذیل میں بھی آتی ہیں۔ اس ضمن میں مجھے اُن کا وہ طویل قلمی خاکہ سب سے زیادہ پسند آیا جو انھوں نے "بھائی صاحب" کے عنوان سے اپنے برادرِ بزرگ حکیم عبد الحمید کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ جو "نذر حمید" نامی ارمغاں میں شامل ہے۔ اسی طرح حکیم صاحب کے سفر ناموں میں بھی اکثر جگہ ڈائری اور رپورٹنگ کے علاوہ ادبی اسلوب کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔

حکیم محمد سعید نے دنیا کے تقریباً تمام براعظموں کی سیاحت کی ہے۔ انھیں اپنے مقام و منصب کے لحاظ سے وہ پذیرائی بھی حاصل رہی جو عام مسافروں کے حصے میں نہیں آتی اس لیے عام آدمی کا تجربہ تو ان کے سفر ناموں میں ہے ہی لیکن خاصانِ مے خانہ کی سرمستی اور رموز و اسرار بھی جگہ جگہ جلوہ گر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح ہماری سیر امکنہ و امصار کے علاوہ ایسی شخصیات تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ جنھیں ہم اب تک دور کا جلوہ سمجھتے رہے ہیں۔

حکیم صاحب کے ہر سفر نامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک میں ہر اہم ملک کے معلوماتی کوائف ہوتے ہیں اور دوسرے میں حکیم صاحب کے ذاتی تجربے، مشاہدے اور تجزیے۔ اسی لیے ان کے سفر نامے نہ محض واقعات و معلومات کی کھتونی ہیں اور نہ سفر نگاری کے نام پر خالص افسانہ نگاری۔

یہ سفر نامے اتنے ضخیم اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ انفرادی طور پر ہر ایک کا سرسری جائزہ بھی پیش کرنا ممکن نہیں اسی لیے میں نے ان کی مجموعی خصوصیات کو بیان کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ پھر بھی چند مثالیں اور حوالے ناگزیر نظر آتے ہیں۔

حکیم صاحب کو طب کے بعد یا شاید طب سے بھی پہلے جس چیز سے سب سے زیادہ لگاؤ ہے وہ تعلیم ہے۔ وہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کے نظام تعلیم اور درس گاہوں کی خصوصیت کے ساتھ جائزہ لیتے اور پاکستان سے اس کا موازنہ کرتے اور اپنے ذہن میں کچھ منصوبے بھی بناتے جاتے ہیں۔ شاید اسی مسلسل فکر اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مدینتہ الحکمت جیسے عظیم منصوبے کو عملی جامہ پہنایا اور اپنے منصبِ گورنری کے دور میں چار نجی جامعات کو چارٹر عطا کیا۔

ایک سفر نامے میں حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ برن یونی ورسٹی کے شعبۂ طبیعیات میں تحقیقی مقالہ پیش کرنے کے لیے حکیم صاحب کو مدعو کیا گیا۔ سفارت خانۂ پاکستان کی موٹر جامعۂ برن نہیں پہنچ سکی۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

"موٹر کے عین وقت پر خراب ہو جانے سے لے کر پہلے سے طے شدہ اس کی دوسری مصروفیات تک مختلف وجوہ ہوسکتی تھیں۔ لیکن یہ معلوم کر کے انتہائی تعجب ہوا کہ موٹر ڈرائیور کو جامعہ کا راستہ نہیں مل سکا۔ یہ سُن کر کہ ڈرائیور کو جامعہ کا راستہ نہیں مل سکا۔ میری بیٹی سعدیہ نے اس صورتِ حال پر یہ طنز کیا کہ ہمارے سفارت خانہ والوں کو یونی ورسٹی سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

(سوئزرلینڈ میں۔ ص ۷۲)

اسی جامعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ جب حکیم صاحب کا لیکچر ختم ہوا تو انھیں جامعہ برن کی طرف سے دو سو پچاس سوئس فرانک بطور اعزازیہ پیش کیے گئے جو پاکستانی ایک ہزار روپے کے مساوی تھے۔ لیکن حکیم صاحب نے وہ ساری رقم شکریے کے ساتھ لوٹا دی اور ان کو بتایا کہ وہ علمی خدمت کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتے۔ آگے لکھتے ہیں:

"انھیں کیا معلوم تھا کہ شریف خانی اور ہمدرد خانی حکیم، مریض کو دیکھ کر اور اس کا نسخہ لکھ کر کوئی فیس نہیں لیتے۔ خواہ یہ معائنہ اپنے مطب میں کیا جائے یا مریض کی رہائش گاہ پر۔ یہ عظیم خاندانی روایات ہیں، جن کا پاس ولحاظ میں بدرجہ اتم کرتا ہوں۔"

اس طرح کی تحریروں سے نہ صرف حکیم صاحب کے بارے میں بعض حیرت انگیز واقعات کا علم ہوتا ہے بلکہ مشرقی اقدار سے ان کے ہاں لگاؤ کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کے سفرناموں میں ان کی دو تشویش ناک علالتوں کا بھی تذکرہ ہے ایک شدید حملۂ قلب سے متعلق ہے جو ۱۹۵۶ء میں ہوا تھا اور ایک ۱۹۷۷ء میں امراض چشم کے ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ حکیم صاحب کا قرینہ ڈیمج ہو چکا ہے۔ اب حکیم صاحب کا علاج سُنیے تحریر فرماتے ہیں:

"دوا تو خیر میں کھاتا ہی نہیں، نہ اپنی اور نہ "غیر کی"! ایک گلاب بیس کر پینا شروع کر دیا اور عرق گلاب، عرق پودنیہ عرق الائچی ملا کر دن میں کئی کئی بار پیتا رہا۔ دکھانے کے لیے لیٹا بھی رہا۔ مگر میں زیادہ دیر لیٹ ہی نہیں سکتا، سخت دردِ کمر ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں لیٹنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں، تنازع للبقا میرا مقام ہے۔"

حکیم صاحب جس طرح روزمرہ واقعات سے نتائج کا استنباط کرتے اور انھیں رہنمائے حیات بناتے ہیں اس سے اُن کے حکیمانہ مزاج کا جگہ جگہ ثبوت ملتا ہے اور قاری اچنبھے اور حیرت انگیز مسرت میں ڈوب جاتا ہے۔

۱۹۸۶ء گویا اب سے نو سال قبل حکیم محمد سعید صاحب نے "ماہِ سعید" کے صفحہ ۶۱ پر سندھ کی صورتِ حال پر آنسو بہائے ہیں اظہارِ افسوس جن باتوں پر انھوں نے اُس وقت کیا تھا وہ ختم یا کم نہیں ہوئیں بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس موقع پر حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

"حضرتِ محترم مولانا ابوالکلام آزاد کے علم و فضل کا میں گرویدہ، جب اُن سے رخصت لینے گیا کہ پاکستان جارہا ہوں تو انھوں نے پاکستان کے لیے کلماتِ خیر و دعا ارشاد فرمائے۔ مگر ان کی یہ رائے تھی کہ اگر صراطِ مستقیم اختیار نہ کی گئی تو ۲۴-۲۵ سال میں پاکستان میں حالات دگرگوں ہوں گے اور مسائل شدید تر ہوں گے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ٹھیک اسی مدت میں خود ہم نے پاکستان کو دولخت کر دیا ہے اور اب ہم خود ہی اس

"نئے پاکستان" کو لخت لخت کر دینے پر مصر ہیں اور تیار...... حضرت محترم مولانا آزاد نے جس صراطِ مستقیم کی طرف اشارہ کیا وہ بدیہی طور پر تعلیم میں انقلاب ہے۔ جس سے ہم نے آزادی کے بعد سے آج تک صریحاً اغماض برتا ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ حکیم صاحب تعلیم میں انقلاب کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اور ہماری تمام تر خرابیوں کا علاج تعلیم ہی کو تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ کوریا جا کر بھی حکیم صاحب کو پاکستان میں تعلیم کی حالتِ زار کا خیال آتا ہے فرماتے ہیں:

"ماتم یہ ہے اور سخت ماتم ہے کہ ہم پاکستان میں نظام تعلیم مرتب کرنے میں آزاد نہیں رہے ہیں۔ تعمیر وطن کی اس اساسی اور بنیادی ضرورت پر بقراطی (بیورو کریٹک) فکر و نظر حاوی و غالب رہی اور میں اس بقراطیت کی امانت و دیانت پر سخت شبہ کرتا ہوں کہ اس کی وجہ سے پاکستان ہنوز جہل اور جہالت کی گرفت میں ہے۔"

انہی سفرناموں میں کہیں کہیں حکیم صاحب زمان و مکاں کی حد بندیوں کو توڑ کر اپنی زندگی کے غائب اور موجود لمحوں تک پہنچ جاتے اور اس میں بھی ان میں شریک کر لیتے ہیں "یونان اور جنوبی افریقہ" کے سفرنامے "ریگ رواں" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں میری زندگی کا ۱۷واں سال ہے۔ سولہ برس تک کی زندگی کا مختصر احوال یہ ہے:

پانچ سال کی عمر میں ناظرہ ختمِ قرآن حکیم:
سات سال کی عمر میں حج بیت اللہ
نو سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ حکیم
بارہ سال کی عمر میں دسویں کی کتابوں کی تعلیم
چودہ سال کی عمر میں اردو ادب کا مطالعہ
سولہ سال کی عمر میں فارسی اور عربی کی تعلیم

اس کے بعد سارے حصے مطالعے کے لائق ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے ساری زندگی کام کام صرف کام کے ذریعے کس طرح یہ دشوار راستے طے کیے ہیں۔ اور ان کے والدِ محترم حکیم حافظ عبدالمجید صاحب نے ۱۹۰۶ء میں ہمدرد قایم کر کے اپنی اولاد سے جو توقعات وابستہ کی تھیں انھیں زندہ حقیقت کا پیرہن عطا کر دیا۔

حکیم صاحب کا ایک اہم سفرنامہ "درونِ روس" ہے۔ اس کی اہمیت میرے نزدیک یوں بھی ہے کہ یہ اس دور کا احاطہ کرتا ہے جب دنیا کی یہ عظیم طاقت اپنی تشکیل و تعمیر کے محیر العقول مراحل سے گزر کر شکست و ریخت کی ناقابل یقین منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ میخائل گورباچوف کا زمانہ ہے۔ معاملات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور اس قسم کے خیالات سامنے آ رہے ہیں:

"انسان آج ایک ایسے عہد میں سانس لے رہا ہے کہ جہاں کوئی سوسائٹی یا اس کے عوام نئے نظریات اور نئی نئی معلومات سے خود کو الگ تھلگ رکھ ہی نہیں سکتے قومی سرحدوں کے اندر ویکسین (ٹیکے) کو تو آنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن جراثیم نظریات و خیالات اور نشریات کو ملک میں داخل ہونے سے یہ سرحدیں نہیں روک سکتیں۔

اس نئی حقیقت کا ایک لازمی جغرافیائی وسیاسی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی ایک ملک کا حقیقی تحفظ اور

سلامتی ممکن ہی نہیں ہے۔ جب تک یہ تحفظ سب کے لیے نہ ہو۔"

(درونِ روس ص ۱۷۸)

حکیم محمد سعید کے سفر ناموں کی یہ چند جھلکیاں شاید آپ کو اس منزل تک لے آئی ہوں گی کہ ان سفر ناموں میں علم و دانش، بصیرت و حکمت کے بے شمار گوہر آبدار پنہاں ہیں۔ میں ذاتی طور پر ادب برائے زندگی کا قائل ہوں اور تحریروں کی EDUCATIVE VALUE ہی مجھے زیادہ متاثر کرتی ہے جس سے انسان اپنے ذہن اور شخصیت کی تعمیر میں مدد لے سکے اور اپنے ذہن کو غور وفکر کی جدلیات سے وابستہ کر کے نوع انسانی کے لیے بہتر نتائج اخذ کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے حکیم محمد سعید کے یہ سفر نامے بہت مفید اور دانش آموز ہیں۔ ہمیں حکیم صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اپنی سیر وسیاحت کے دوران وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنا ہم سفر بنا لیتے ہیں اور ہم عالمِ ممکنات سے عالمِ محسوسات تک کے دائروں میں جولاں و جنباں رہتے ہیں اور غالب کا شعر پڑھتے رہتے ہیں:

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

فرہنگ اصطلاحات بنکاری

تشکیل۔ ترجمہ۔ تدوین

محمد احمد سبزواری

معاونت و مقدمہ

جمیل الدین عالی

قیمت دو سو روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی 159 بلاک 7 گلشن اقبال کراچی

حکیم صاحب

مسعود احمد برکاتی

شخصیت مختلف الجہات نہ ہو اور لکھنے والا اس کا ہم عصر بھی نہ ہو تو بہت سی تفصیلات چھٹ چھٹا کر اور چھن چھنا کر اجمال کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ بہت سے پہلوؤں کو بُعد زمانی نگل جاتا ہے اور وقت کی کسوٹی معاصرت کے عدم توازن کو ہموار کر دیتی ہے۔ اس طرح بعض تفصیلات اور جزئیات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور بعض پہلوؤں کو ان کے حقیقی اور تاریخی تناظر میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم عصر لکھنے والا ایک تو ذاتی جذبات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکتا دوسرے اس کے لیے اہم اور کم اہم کا قطعی فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ آج اسے جو کام کارنامہ معلوم ہو رہا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ وقت کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد قابلِ ذکر بھی نہ رہے اور جو کام اس وقت معمولی نظر آرہا ہے وہ اپنے نتایج اور اثرات کے لحاظ سے مہتم بالشان کارنامہ قرار پائے۔ حکیم محمد سعید کے شخصی یا ذاتی مطالعے میں یہی صورت حال درپیش ہے۔ تاہم مجھے ہمراہی اور رفاقت کے جو فوائد حاصل ہیں وہ اپنی جگہ اہم ہیں اس لیے کوشش کی ہے کہ حقائق کو معروضی نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا جائے۔ یہ کوشش بھی ہے کہ جس کیفیت کو غالب نے مستئِ تحریر کہا ہے وہ بھی غائب نہ ہو جائے۔

حکیم محمد سعید کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو حرکت ہے۔ وہ ایک متحرک ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے کاموں میں ہم جو غیر معمولی رنگا رنگی اور تنوع دیکھتے ہیں وہ اسی متحرک اور اخاذ ذہن کا کرشمہ ہیں ان کا ذہن بند گلی نہیں ہے بلکہ کیٹس کے الفاظ میں ہر قسم کے خیالات اور تجربات کے لیے ایک شاہراہ عام (THOROUGFARE) ہے۔ ان کے ذہن میں خیالات کی مسلسل آمد ہوتی ہے اور وہ ان خیالات کو عمل میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ خیالات کا یہ ورود شاعرانہ انداز بیان کے بجائے منصوبوں اور عزائم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خیالات دن کے خوابوں اور مجہول استغراق کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور گوش ہوش سے سننے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے معمولات کا ایک حصہ تنہا نشینی بھی ہے جسے وہ ایک زمانے میں "اعتکاف علمی" کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ معتکف ہوگئے ہیں اور اتنے دن تک نہ وہ کسی سے ملیں گے اور نہ کسی مسئلے میں ان سے رجوع کیا جاسکتا ہے چاہے وہ مسئلہ کتنا ہی اہم ہو۔ یہ اعتکافی مدت پوری یکسوئی کے ساتھ مسائل کا جائزہ لے کر خیالات کو پکانے اور منصوبہ بندی کرنے کے لیے ہوتی تھی۔

حکیم صاحب نے اپنی عمر کے ابتدائی ۲۸ - ۲۹ سال اپنے برادر بزرگ حکیم عبد الحمید صاحب کے ساتھ گزارے۔ انھی کی تربیت نے ان کو حکیم محمد سعید بنایا، خود حکیم صاحب متعدد بار اس کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ محنت، لگن، یکسوئی اور سلامت روی

کے اجزا حکیم صاحب کی شخصیت میں بڑے بھائی کی ہی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ حکیم عبدالحمید کی تربیت کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے پر اپنے چھوٹے بھائی کو جدوجہد کی طرف راغب کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم صاحب کی نظر میں اپنے برادرِ محترم کی حیثیت ایک آئیڈیل شخصیت کی ہے۔ بچپن میں حکیم صاحب کے مزاج میں کھلنڈرا پن تھا اور شاید ہی کوئی کھیل ہو جو انھوں نے نہ کھیلا ہو ان کا بچپن گلی ڈنڈے، شطرنج اور کیرم سے لے کر بیڈمنٹن اور فٹ بال تک سے عبارت ہے۔ ٹینس کھیلنے کے لیے تو اب بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

پاکستان بنا تو حکیم صاحب اپنی زندگی کی تیسری دہائی مکمل کر رہے تھے اور کھلنڈرا پن ختم ہو گیا تھا، کیوں کہ ۱۹۳۹ء میں وہ طبیہ کالج دہلی سے طب کی سند لے چکے تھے اور ۱۹۴۱ء سے ہمدرد صحت کی ادارت میں بڑے بھائی کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمدرد دواخانے کی تعمیر و ترقی کا اہم دور تھا جس میں دونوں بھائی شریک تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب صاحب حکیم صاحب کو بتدریج ذمہ داریاں سونپنی شروع کیں اور خوش اسلوبی سے تمام کام سکھائے۔ حکیم صاحب میں بڑے بھائی سے زیادہ تیزی اور تیز رفتاری تھی۔ اس کا خوش گوار اثر ہمدرد کی رفتار ترقی پر نمایاں ہوا اور نہ صرف ہمدرد کے کاروبار کو وسعت دینے میں بلکہ اس کو شہرتِ عام دینے میں حکیم صاحب کی ذہانت، شوق اور زمانے کے تیور سمجھنے کی صلاحیت نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

آزادی کے بعد حکیم محمد سعید صاحب نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ شاید ان کا مزاج اور طبیعت کی جولانی آزاد فضا کی طالب تھی۔ جے جمائے اور ترقی پذیر کاروبار کے مقابلے میں انھوں نے نئے اور بنتے ہوئے ملک میں نئے سرے سے جدوجہد اور پُرمشقت زندگی کو اختیار کیا۔ حکیم صاحب نے کراچی میں ایک چھوٹے سے کرائے کے کمرے اور کرائے ہی کے فرنیچر میں اس عظیم الشان ادارے کی بنیاد ڈالی جس نے آج متعدد ثقافتی اور تعلیمی اداروں کو جنم دیا اور جو ہمدرد پبلک اسکول سے لے کر ہمدرد یونیورسٹی تک کا بانی ہے اور اب اگر یہ کہا جاتا ہے کہ حکیم محمد سعید خود اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں تو یہ الفاظ اپنی معنویت کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔

حکیم صاحب بتاتے ہیں کہ کراچی میں انھوں نے ابتدا قُوتِ لایموت حاصل کرنے کے لیے نوکری بھی کی۔ یہاں متعدد ایسے اصحاب تھے جن سے ان کے دوستانہ روابط تھے اور وہ یہاں مقتدر تھے، لیکن خود داری اور خود نگری نے ان کے سوائے اپنی صلاحیتوں اور قوتِ عمل کے کسی اور طرف دیکھنے نہیں دیا اور وہ پوری یکسوئی سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ مطب اور دواسازی کے مسائل سے نپٹنے کے علاوہ طبِ مشرقی کی ترویج و اشاعت کو انھوں نے شروع ہی سے اپنی ترجیحات میں شامل رکھا جس کے لیے سب سے پہلے ہمدرد صحت کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اور پھر چند سال بعد بچوں کے لیے ہمدرد نونہال کا اجرا ان کی تعلیمی تحریک کی بنیاد بنا جو اب ہمدرد یونی ورسٹی تک پہنچ گئی ہے۔ اشاعتِ کتب کے لیے ایک اشاعتی شعبے کا قیام اور طبی، دینی اور علمی ادبی کتابوں کی اشاعت بھی حکیم صاحب کے ذوق نمو کی آئینہ دار ہے لیکن مطب کو ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے انھوں نے اپنی طبیب کی حیثیت کو ہمیشہ اولیت دی ہے۔ جس باقاعدگی اور پابندی سے وہ مطب کرتے ہیں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ کسی بیرونِ ملک کے طویل دورے کے بعد بھی اگر وہ رات کو وطن واپس پہنچے ہیں تو وہ آنے والی صبح مطب میں موجود ہوئے ہیں اور اسی توجہ اور دل جمعی کے ساتھ مریضوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ان کی خصوصیت ہے۔ چاہے وہ وزیر رہے ہوں یا گورنر، مطب جانا اور مریضوں کو مشورہ دینا انھوں نے کبھی نہ چھوڑا۔ ہر ہفتے کراچی میں دو دن مطب کرنے کے علاوہ وہ لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں ہر مہینے دو دن کے لیے مطب کرتے ہیں۔ جب پاکستان دولخت نہیں ہوا تھا تو وہ ہر مہینے

ڈھاکے بھی جایا کرتے تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ نو عمری میں، میں طبیب بننے کے بجائے صحافی بننا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا، کہ حکیم صاحب نے فن طب اپنایا کیوں کہ انھوں نے عملی اور علمی دونوں میدانوں میں طب کی اشاعت و ترویج کے لیے جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں وہ شاید تشنۂ تکمیل رہ جاتے۔ آج وطن عزیز میں طب مشرقی کو مقبولیت اور عظمت کا جو مقام حاصل ہے اس میں سے حکیم صاحب کو منہا نہیں کیا جاسکتا۔ پھر طب کو جدید زبان میں اور بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے اور عالمی ادارۂ صحت سے منوانے کی خدمت بھی صحافی محمد سعید کی نہیں بلکہ حکیم محمد سعید کی مرہونِ منت ہے۔

طب کو پاکستان میں بڑے مشکل دن بھی دیکھنے پڑے ہیں۔ شروع میں تو معمولی جڑی بوٹیوں کی فراہمی بھی ایک کارے دارد پھر پہلی جمہوریت کشی کے بعد ایک فوجی وزیر صحت نے تو ایک طبی وفد سے صاف کہہ دیا تھا کہ مراعات کا کیا سوال ہے؟ ہم اس اتائیت یعنی طب کو خلاف قانون قرار دینے والے ہیں، مگر حکیم صاحب نے شب و روز جاگ کر اور جگا کر تحریک چلائی اور انھی صاحب کو اطبا کے رجسٹریشن کا قانون پاس کرنے پر مجبور کر دیا۔ حکیم صاحب خالص طبیب ہیں، اپنے معالجات میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے، تالیفی ادویہ استعمال نہیں کرتے، لیکن طریق علاج کے بارے میں وسیع نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ تحقیق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جدید طب اور سرجری کی مفید ترقیوں کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ علم کی پیش رفت کے قائل ہیں۔ اگر کسی مرض کا علاج ایلو پیتھی میں یا ہومیو پیتھی میں بہتر ہو سکتا ہے تو مریض کو اس سے رجوع کرنے کا مشورہ دے دیتے ہیں، لیکن فطری طریق علاج کی شفا بخشی پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ اور اب تو ساری دنیا نباتات کا گن گا رہی ہے۔

آئن سٹائن کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا، وہ جس صابن سے نہاتا تھا اسی سے شیو بھی کر لیتا تھا۔ اپنے دور کا یہ سب سے بڑا سائنس داں کہتا تھا کہ دو قسم کا صابن استعمال کرنے سے زندگی بڑی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ سفید شیروانی اختیار کرنے کا محرک یہ ہے کہ شیروانی پہنتے وقت رنگ کے انتخاب میں توجہ اور وقت صرف نہ ہو۔ حکیم صاحب بھی وقت کی فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتے۔ وقت کی کفایت شعاری کوئی ان سے سیکھے۔ وہ اتنے کام اور اتنے متنوع، کام کرتے ہیں کہ مشکل سے یقین آتا ہے۔ علاج معالجے، تحریر و تصنیف انتظامی اور دفتری امور، میٹنگیں، خطوط نویسی، اخبار بینی، سفر، جلسے، کانفرنسیں، تقریریں، سماجی تقریبات میں شرکت اور نہ معلوم کتنے کام کرتے ہیں اپنے نام موصول ہونے والے خطوط ضرور پڑھتے ہیں اور ان کے جوابات بہت التزام کے ساتھ دیتے ہیں۔ ملک میں اور بیرون ملک خطوط خود بھی خاصی تعداد میں لکھتے ہیں۔ بچوں کو بھی بڑی شفقت سے خطوط لکھتے ہیں بچے حکیم صاحب کو خط لکھتے ہیں تو "پیارے انکل" یا میرے پیارے دوست" سے مخاطب کرتے ہیں۔ حکیم صاحب بھی اپنے آپ کو "تمھارا دوست اور ہمدرد لکھتے ہیں۔ ہمدرد نونہال میں کھوسٹ کے ایک بچے کا مضمون چھپا تو اسے پڑھ کر اس بچے کو خط لکھا کہ تمھارے قصبے میں زلزلہ آیا تھا، اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ ہمدرد نونہال شائع ہوتا ہے تو وہ دوسرے دن پورا رسالہ پڑھ کر بھیج دیتے ہیں۔ سرخ قلم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں اور اس کو فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا مطالعہ وہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر کرتے ہیں۔

ذکر تھا حکیم صاحب کے وقت پر حکومت کرنے کا۔ ان کا عمل اس کا گواہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ وقت کی قلت کی بے جا شکایت کرتے ہیں۔ وقت کی کمی نہیں بلکہ اس کو ضائع نہ کرنے کے سلیقے کی کمی ہوتی ہے۔ ہم وقت کو نہایت بے دردی سے ضائع کرتے ہیں، بلکہ بڑی سفاکی سے اپنے وقت پر خود ڈاکا ڈالتے ہیں اور پھر نہایت بھولے پن سے خود ہی چور کو تلاش کرتے

ہیں۔ حکیم صاحب وقت کی دولت کو خوب خرچ کرتے ہیں، لیکن لٹاتے نہیں بلکہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وقت اور علم کا مزاج یہ ہے کہ اس کو جتنا استعمال کرو اتنا ہی بڑھتا ہے۔ حکیم صاحب اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں اس لیے وہ وقت کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ وقت ان کے پیچھے بھاگتا ہے۔

حکیم صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں سفر کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے پہلا سفر ۱۹۵۲ء میں اپنے برادر محترم کے ساتھ کیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک میں گئے تھے۔ دوسرا سفر ۱۹۵۶ء میں کیا اس سفر میں بھی دونوں بھائی ساتھ تھے یہ طویل سیاحت تھی اور کوئی تین مہینے تک جاری رہی۔ یہ یورپ کا پہلا سفر تھا۔ اس کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدہ تھا۔ اس سفر میں حکیم صاحب نے ترقی یافتہ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد تو حکیم صاحب کے سفروں کی تعداد کا شمار مشکل ہے۔ آئے دن سفر کرتے ہیں۔ دنیا کے اکثر قابلِ ذکر ممالک میں وہ ایک سے زیادہ بار جا چکے ہیں۔ ان سفروں نے ان کے ذہن کے دریچے کھول دیے ہیں اور مشاہدات سفر نے مطالعہ کتب سے زیادہ ان کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ہر ملک کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملتے ہیں، ان سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور ان کے افکار سے استفادہ کرتے ہیں۔ دنیا کے دانش وروں کی دوستی نے خود ان کو ہمدرد، کو اور پاکستان کو فائدہ پہنچایا۔ اب تک وہ اردو کو دس سفرنامے دے چکے ہیں اور بچوں کے لیے تو ان کے سفرناموں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ چکی ہے۔ اس طرح حکیم صاحب بدلتی ہوئی دنیا، علم کی پھیلتی ہوئی سرحدوں اور تہذیب کے نئے رخوں سے نہ صرف خود آگاہ ہوئے بلکہ انھوں نے اردو ادب کی ثروت میں بھی اضافہ کیا۔

اردو کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اردو کی ترقی سے حکیم صاحب کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور اس کا ایک مظہر ان کی تصانیف کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ادارہ ہمدرد کی دفتری زبان اردو ہی ہے ہمدرد کے مختلف شعبوں میں زیادہ تر کام اردو ہی میں ہوتا ہے اور سوائے اس کے کہ کوئی مجبوری ہو انگریزی کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ حکیم صاحب نے یونیسکو میں اپنے تعلقات سے کام لے کر یونیسکو کے ماہنامہ کورئیر کا اردو ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں جاری کرایا اور چودہ سال تک یہ علمی اور عالمی رسالہ پوری پابندیٔ وقت اور باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ اس کے ذریعہ سے سائنسی، ثقافتی اور تعلیمی موضوعات پر وہ مواد اردو میں منتقل ہوا جس نے اردو کی ثروت میں وقیع اضافہ کیا۔ افسوس کہ نوکر شاہی کو یہ گوارا نہ ہوا اور وزارت تعلیم کے بقراطوں نے اس رسالے کی اشاعت بند کرنے کی یہ حسین تدبیر اختیار کی کہ ہمدرد فاؤنڈیشن سے یہ رسالہ لے کر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے سپرد کر دیا جس نے ایک سال میں اس ماہ نامے کے صرف تین شمارے نکالے اب تو اس کی کئی برسیاں ہو چکی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کیا جوہر ہے کہ جس کی بنا پر ایک شخص نے بے سروسامانی اور کم وسائل کے باوجود اتنی ترقی کی، اتنے اعزاز حاصل کیے، اتنے ادارے بنائے، اتنی تحریکیں چلائیں، اتنے عہدے حاصل کیے، اتنی دنیا دیکھی، اتنی محبت اور عزت پائی!

ہمارے لیے اور خصوصاً نوجوانوں کے لیے حکیم صاحب کی زندگی میں بڑا سبق ہے!

رباعیاتِ اقبال کے خاص نکات

ماہ طلعت زاھدی

اقبال، حرکت، عمل اور ہر لمحہ بدلتی زندگی میں پائندہ اقدار کے متلاشی وہ شاعر عظیم ہیں، جو بیسویں صدی کی عالمی شاعری میں ممتاز ترین دیکھے جارہے ہیں۔ اُن کے ہاں، ہجر اس لیے ایک اہم قدر کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ لہو کو گرم رکھنے اور آدمی کو فعال بنانے کا ایک بہانہ ہے۔ اقبال نے منزل سے آگے نکلنے کی راہ سجھائی ہے۔ منزل پر پہنچنے کی تن آسانی اُنھیں ہر گز قبول نہیں۔ اُنھیں سفر عزیز ہے۔ ایسا سفر جو اس حیات و کائنات سے بھی ماوراء لے جائے۔ اُن کی شاعری جہدِ مسلسل کی شاعری ہے۔ شجاعت، غیرت، جہاد، اقبال کی شاعرانہ تمثیلوں کے کردار ہیں۔ اقبال کے ہاں مایوسی، قنوطیت، بے چارگی جیسی کیفیات چھو کر بھی نہیں گزریں۔

وہ شوپن ہار اور کیر کے گار کے فلسفے سے نہیں، مارکس اور اسٹالن کے انقلاب سے متاثر ملتے ہیں۔ اُن کے ہاں تصوف بھی خانقاہی سکوت کا نام نہیں، سید احمد شہید بریلوی کی شہادت کا پیغام ہے۔ اقبال بار بار دُہراتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کی قربانیاں جس دائرہ معاشرت کی تکمیل کرتی ہیں، دراصل یہی دائرہُ معاشرت "اسلام" کا نام ہے۔ اس لیے کچھ تعجب کی بات نہیں، اگر اقبال اپنے بیشتر کلام کی طرح اپنی رباعیات میں بھی موضوعِ گفتگو اسلام کو اور مخاطبِ سخن "مسلمان" کو بنائیں۔ چنانچہ اقبال اپنی بہت سی رباعیات میں اپنے قارئین سے ایسی ہی بھرپور معاشرت کے سرگرم رکن بن جانے کا تقاضہ کرتے نظر آتے ہیں، جو معاشرت آج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہے، مگر ماضی میں ہمارے لیے باعثِ صد افتخار رہی:

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو
فروغ دیدہُ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور
کہ شاہینِ شہہِ لولاک ہے تو

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ

کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

مگر ہمارا امروز وہ زمانۂ بے چارہ ہے، جس کے خدوخال اقبال نے چھ، سات دہائی قبل ہی پہچان لیے تھے۔ چنانچہ آج دُنیا بھر میں مسلمانوں کی جو "گت" بن رہی ہے، اُس سے چھٹکارا دلانے کے لیے اقبال نے مدتوں پہلے اُمتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو للکارا تھا:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی، خود گزینی
سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

اقبال جس "تہذیبِ حاضر" کی طرف بار بار اشارہ کرتے ملتے ہیں، اُس نے آج ہمارے معاشرے کو پوری طرح جکڑ لیا ہے۔ اقبال کو تو صرف فرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں کے عیش و عشرت نے چونکا دیا تھا۔ آج کی زندگی میں ڈش اینٹینا اور کلاشنکوف نے اپنا رنگ اس طرح جمایا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اِرد گرد نظر نہیں ڈال سکتے۔ ایک مکڑی کا جال ہے، جس نے ہم لوگوں کو گھروں میں محدود اور سڑکوں پر معذور کر دیا ہے۔ ہمارے اپنے شہر، اپنے لوگ لہو میں نہا رہے ہیں، لیکن ہم بد توفیقی کی اُس لعنت میں مبتلا ہیں کہ پُرسشِ احوال بھی نہیں کر سکتے۔ دراصل اقبال کے بقول ہم اپنے اسلاف، اپنی تابندہ روایات، اعتقادات، اور اپنی ذات تک سے بے یقین ہو چکے ہیں۔ اس مرحلے پر ایک کھوکھلا وجود رہ جاتا ہے جو راستہ بنا نہیں سکتا، صرف تقلید کی انگلی تھام کر چلتا ہے:

ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے
ترا دم گرمئ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

000000

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہیں ہنگامے کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

اقبال جس خرد سے بیزار نظر آتے ہیں، یہ خرد کا وہ تخریبی پہلو ہے جو خرد کو مسلسل معاشرے سے کاٹ رہا ہے۔ یہ خرد وہ ہے جو باطن سے علیحدہ ہو کر صرف ظاہر کی جلوہ سامانیوں تک محدود رہ گئی ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اگر محض ٹیکنالوجی کی ایجادات ہی انسان کو سکونِ قلب اور اطمینانِ جاوداں بخش سکتیں تو آج کا ہمارا عہد گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سرور بخش ہوتا۔

مگر ایسا نہیں بلکہ برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیکنالوجی سے بھی فائدہ وہی قومیں اُٹھا رہی ہیں جو خلقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہیں۔ مسلسل ترقی پر یقین رکھتی ہیں، جہالت کی بیڑیاں کاٹ کر پھینک چکی ہیں اور اپنے بارے میں پر اعتماد ہیں۔

ہمارا گزارا تو صرف "اُن کی" ہاں میں ہاں ملانے پر ہو رہا ہے۔ بظاہر ہم غلام نہیں مگر ہم غلاموں سے بھی بدتر ہیں۔ غلاموں میں آزادی پانے کی ایک تڑپ ہوتی ہے۔ ہم ہر قسم کی تڑپ سے بے نیاز ہیں۔ اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں:

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ، زندوں کا خدا ہے

کیا اُمتِ مسلمہ موت سے دوچار ہو چکی ہے؟ اقبال کو تو اس تلخ حقیقت کا یقین اس صدی کے شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ لیکن آج بوسنیا، کشمیر فلسطین، افغانستان اور خود ہمارے وطنِ عزیز کے دگر گوں حالات ہمیں بار بار یہ سوال سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں!

نظر چرانے سے کام نہیں چلے گا اور پردہ پوشی کا وقت اب رہا نہیں۔ محض اقبال کی عظمت کے گن گاتے رہنا بھی بے سود ہے کیونکہ اُن کی تعریف و توصیف تو اقوامِ غیر بھی کر رہی ہیں۔ لیکن خود اقبال کا خطاب چونکہ اُمتِ مسلمہ سے ہے، اس لیے اقبال ہمارے شاعر اُسی وقت مانے جائیں گے۔ جب ہم اقبال کے پیغام کو سمجھ سکنے کے قابل ہونگے۔ ورنہ یومِ اقبال محض تعطیل کی راحت میں بدل کر رہ جائے گا۔ اور اقبال کے لفظ ہمارے لیے بے جان ہو جائیں گے۔

اقبال کے اشعار کی روح وہ آئندہ نسلیں ہیں جو غیرت و حمیت سے متصف، جہد و عمل سے سرشار، اپنے ماضی پر فخر کرتے ہوئے اپنے مستقبل کی معمار، حال کے ہر ہر لمحے پر اپنی مہر عدل و صداقت ثبت کریں گی:

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیث لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی

000000

اقبال .... ایک آفاقی شاعر

شعیب النصر

اردو کے کلاسیکل شعری ادب کا بڑا حصہ داخلی یا ذاتی شاعری پر مبنی تھا، سب شاعر اپنے دکھڑے بیان کرتے اور یہ درد، دکھ اور غم سب غم جاناں ہوتے، خاص طور پر ہماری اردو غزل تو بیشتر "درباری شاعری" اور "عشقیہ شاعری" رہی ہے۔ غالب، ذوق اور ناسخ جیسے عظیم شعرا بھی اِسی قسم کی شاعری کے میر کارواں رہے ہیں، اور پھر جن شاعروں کو درباری اور عشقیہ شاعری سے نفرت تھی، وہ تصوف کی پناہ میں آگئے اور راہبانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ خواجہ میر درد اور خواجہ حیدر علی آتش کے نام ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن یہ عاشقی اور تصوف دونوں پختہ نہ تھے۔ شروع میں اقبالؒ کی شاعری بھی اسی قسم کی تھی، جیسے ایک مقام پر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہدی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

عشقیہ شاعری ...... دل کی شاعری ہے اور اقبالؒ دل کا نہیں، دماغ کا شاعر ہے۔ ان کے نزدیک عشق ایک اضطراری، چھا جانے والا اور دنیا سے محو کر دینے والا جذبہ ہرگز نہیں بلکہ زندہ حقیقت ہے اور اقبال اُس حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عشق اقبال کی شاعری کا "باعث" یا "ساماں" نہیں بلکہ "مقصد" ہے۔

غزل جب اُردو میں آئی تو تصنع بھی اس کے ساتھ آیا۔ لفظی خوبیاں جب شاعر کا اصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اقبال کی ابتدائی غزل میں داغ کا رنگ غالب ہے، داغ سے انھوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے بہت معترف بھی تھے۔ اُس دور میں اقبال کی کہی ہوئی ایک غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر
ہم کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دیکھا جائے تو یہاں اقبال کا تغزل روایتی، بے روح اور بے رنگ ہے۔ اس دور کی غزلیں ابتداء سے لے کر آخر تک حقیقت کا خفیف سا اثر بھی پیدا نہ کر سکیں۔ لیکن اِن سطحی لذتوں سے اقبال جلد اُکتا گئے اور اس سطح سے گزر کر زندگی کی گہرائیوں میں

اترے اور جو کچھ تخلیق کیا، وہ عہد آفریں شاعری ہے۔ اُن کی وطن پرستی، انسان دوستی، مولانا رومی سے والہانہ وابستگی، ذوقِ آگہی، تہذیبِ مغرب سے بیزاری اور جراتِ رندانہ غرض ان کے ذہنی ارتقا، کا ہر پہلو اک نئی شان سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہوا جسے خواجہ الطاف حسین حالی کے وقت تک "بدعت" قرار دیا جاتا رہا مگر اقبال نے اپنی شاعرانہ شخصیت کے زور سے اس بدعت کو اردو شاعری بلکہ جدید شاعری کا بنیادی اصول بنا دیا۔ اقبالؒ کی شاعری، غالب کی اُس فریاد کا جواب ہے جو اس نے عشقیہ شاعری سے تنگ آکر اور غزلیہ شاعری کے بندھنوں سے گھبرا کر بلند کی تھی:

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اقبال نے وسعتِ بیاں کے لیے مناسب ظرف مہیا کیا اور جو شاعری کی، اسے اپنے خیال اور فلسفہ کا پابند کیا، خیال کو شاعری کا پابند نہیں کیا۔

یہ کہنا زیادتی ہے کہ اقبالؒ نے صرف اکبر الہ آبادی کا اثر قبول کیا ہے اور اس کا اپنا انداز اور آہنگ نہیں جیسا کہ پروفیسر سلطان نے اپنے ایک مقالے میں (جو ماہنامہ تجدید لاہور (مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا) لکھا ہے۔ فرض کریں اگر یہ بات درست بھی تسلیم کر لی جائے کہ اقبال نے حضرت اکبر الہ آبادی کا اثر قبول کیا ہے تو اس سے اقبال کی شاعری پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خود اکبر الہ آبادی کے ہاں کئی ایسے اشعار موجود ہوں گے جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار غالب یا اقبال کے رنگ میں کہے گئے ہیں، اور پھر مختلف زمانوں اور مختلف سلسلوں کے صوفیائے کرام کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان کے ہاں ایک ربط اور یگانگت پائی جاتی ہے، پھر حضرت اکبر الہ آبادی کا رنگ ایسا نہیں کہ اقبال اُسے اختیار نہ کر سکیں بلکہ اکبری رنگ تو وہ ہے جس سے اقبال شروع ہی سے مانوس ہیں، بطورِ دلیل، پروفیسر صاحب نے جو اشعار نقل کیے ہیں، ملاحظہ ہوں:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدّ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

(بانگِ درا)

ایک اور بند بھی نقل کیا گیا ہے:

یہ کوئی دن کی بات ہے، اے مردِ ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زَن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

حضرت اقبال نے دونوں بندوں میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ صرف انگریزی دانی سے ہی قومی فلاح متصور نہیں، اس کے واسطے کوئی ایسی راہ نکالو جو تمدنی رنگ میں بھی مفید ہو اور کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ جن ممالک میں انگریزی نہیں، وہاں قومی فلاح نہیں ہو رہی۔ دوسرے بند میں اقبال نے زمانے کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے کہ جب عورتیں

کونسل ممبری کے لیے اولاد اور خانہ داری سے سبک دوش ہو جائیں گی .... یہ فکر محض اکبر الہ آبادی کی تقلید نہیں بلکہ اقبال نے اپنے تجربات اور مشاہدات پر مدبرانہ استدلال کے بعد ایک رائے قائم کی ہے اور ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ عظیم شاعر اقبال کے خیالات رفتہ رفتہ کس کس رنگ میں عملی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

اگر اردو شاعری میں کسی کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ وہ "جزویست از پیغمبری" ہے تو وہ صرف اقبال کی شاعری ہے۔ ڈاکٹر عبد الرحمان بجنوری مرحوم لکھتے ہیں (۱) ...... "اقبال کے کلام میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس نے اِس مردہ قوم میں زندگی پیدا کر دی اور مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے دور میں مسیحا بن کر آیا ہے" اقبال تو اب ہماری تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ اس میں ہماری ہی کچھ بہتری ہے کہ ان کے کلام کو کان دھر کے سنیں، وہ خود بھی ہم سے صرف یہی چاہتے ہیں:

اثر کرے نہ کرے، سُن تو لے مِری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب، یہ بندۂ آزاد

اردو ادب تو کیا، دنیا کا کوئی بھی ادب نوجوانوں کے نام ایسا ولولہ انگیز کلام پیش نہیں کر سکا، جیساکہ اقبال نے نوجوانانِ اسلام کو مخاطب کر کے پیش کیا ہے۔ زندگی کا نام صرف عمل ہے، قوتِ عمل کا فقدان موت کے برابر ہے۔ اُس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جس کی عملی قوتیں مردہ ہو چکی ہوں۔ اُمّت مسلمہ بھی اسی مرض کا شکار تھی اور دیکھا جائے تو اقبالؒ نے اس مرض کا درست علاج تجویز کیا۔ ان کی تشخیص تھی کہ اب ہماری ......

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تُو باقی نہیں ہے

میں اردو ادب کے اُن نقادوں سے ہرگز اتفاق نہیں کرتا کہ اقبال کی غزل سلاست، روانی اور بے ساختگی سے محروم ہے۔ ہاں اگر وہ یہ بات ان کی یورپ روانگی سے قبل کہتے تو درست تسلیم کی جاسکتی تھی لیکن وطن آمد کے بعد انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس میں تخیلات کی بلندی، جذبات کی لطافت، شوکتِ الفاظ اور برجستگی سب کچھ موجود ہے اور پھر ان سب پر اقبال کی مخصوص لے سونے پر سہاگہ ہے۔ یہ ایسا کمال ہے جو ہم کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تحقیقی کتاب "اقبالیات کے نقوش" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ۔ "اقبال عظیم شاعر ہے، اگرچہ اس نے کبھی مشاعروں میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بحیثیت ایک ذہین شاعر کے، اس کی شہرت اوائل عمری میں ہی لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں بوئے گل کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ اقبال کی شہرت کو پہلے پنجاب پھر برصغیر میں پھیلانے میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اقبال کی بعض شاہکار نظمیں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" صرف انجمن حمایت اسلام کے لیے لکھی گئی تھیں۔ گو، اقبال پیشہ ور شاعر کی مانند مشاعرہ مشاعرہ جا کر داد بٹورنے کے دھندے سے آزاد تھے۔"

غرضیکہ اقبال کو جس رنگ میں دیکھیے، یکتا اور منفرد نظر آئے گا۔ بنیادی طور پر مفکر اور فلاسفر ہونے کے باوجود اُن عظیم شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے نہ صرف فنی لحاظ سے شاعری کو عظمت و رفعت بخشی بلکہ اپنے دل نواز نغموں اور ترانوں سے

قوم کی مردہ روح میں زندگی کی نئی لہر پھونک کر ایک عظیم ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال نے زندگی کے ہر گوشہ پر جس خوبصورتی اور انفرادیت سے اظہارِ خیال کیا ہے وہ صرف انہی کا خاصہ ہے۔ اقبال کی شاعری، اُن کے صاحبِ بصیرت اور اہلِ ذکاوت ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اب تو اللہ ہی جانے کہ ہمیں ان سا راہبر اور دانائے راز ملے گا بھی یا نہیں:

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

بابائے اردو یادگاری خطبہ

تنقید اور جدید اردو تنقید

مصنّف

ڈاکٹر وزیر آغا

قیمت =/۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان - ۱۵۹- بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

غالب آشفتہ نوا

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

قیمت: =/۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

قُرۃُ العین حیدر کا فن

ایک جائزہ

پروفیسر شاہدہ یوسف

کہا جاتا ہے میر کی شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ اُنھوں نے غمِ ذات کو غمِ کائنات بنا ڈالا۔ قرۃ العین حیدر کا فن بھی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا فن ہے۔

قُرۃ العین حیدر کو اُردو فِکشن کے معماروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ اُن کے افسانے اور ناول صرف داستان طراز نہیں۔ اُن کے ناولوں میں کئی جہان اپنی پوری تاب و توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ پسند اور ناپسند کے مُعاملے میں ان کا اپنا ایک معیار ہے۔ وہ اُردو کی پہلی ناول نگار ہیں جو اپنے ناولوں کی صورت حال میں پہلے خود ایک زِندگی گزار لیتی ہیں اُس کے بعد اسے لفظوں میں ڈھالتی ہیں۔ ہر واقعہ اور ہر کردار پر ان کی عینی شہادت کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ ان کا ذاتی کردار باوقار انداز پر ممتاز ہے۔ ادیبوں اور ادبی معیاروں کے سلسلے میں بھی وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ مثلاً اگر انھیں معلوم ہو کہ ایک شہرت یافتہ ادیب اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ اُس کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی سراہنے کے لیے تیار نہ ہوں گی۔ اسی بناء پر ان کے حلقۂ احباب میں ادیب بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں بھی، وہ اپنی شخصیت کی وجہ سے ان سے رابطہ بڑھا سکے ہیں۔ معاشرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ فرماتی ہیں کہ "ہمارے یہاں کے موجودہ حالات کی وجہ سے اکثر لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں اور یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ کوئی بھی شخص متوازن (NORMAL) نہیں رہنا چاہتا میں اُن لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتا ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر (NORMAL) رہتے ہیں۔"

قرۃ العین حیدر خود سادہ ہیں اور غرور و تکبر سے دُور ہیں جب اُن سے اپنی شخصیت کے متعلق سوال ہوا تو جواباً کہا کہ شخصیت تو ہوتی ہے "مولانا ابوالاعلیٰ مودُودی کی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی۔ ہم کیا اور ہماری شخصیت کیا۔

شخصیت کی تعمیر میں خاندانی عظمت اور علمی ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے قرۃ العین کے والد سیّد سجاد حیدر یلدرم کا ادبی دنیا میں ایک مقام ہے۔ قرۃ العین کی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اہلِ قلم میں ایک نام رکھتی ہیں۔ ان کا پہلا ناول "اختر النساء بیگم" ۱۹۰۸ء میں دار الاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس گھرانے کا تعلق دہلی اور لکھنؤ سے ہے۔ اُردو ادب ان کے وَرثہ میں ہے۔ تقسیم ملک کے بعد قرۃ العین کچھ مدت پاکستان میں سکونت پذیر رہیں۔ ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات و نشریات میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئیں اور لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اتاشی کی حیثیت سے بھی تعینات رہیں۔ کچھ دنوں انھوں نے

پاکستان انٹرنیشنل ائرلائینز میں بھی کام کیا۔ اسی اثناء میں ان کا شہرت یافتہ ناول "آگ کا دریا" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ جس پر پاکستان میں ایک بحث و تنازعہ شروع ہوا۔ قرۃ العین کے لیے مخالفت کے یہ شعلے ناگوار خاطر ہوئے اور وہ ۱۹۶۴ء کے قریب پاکستان سے مستقل طور پر ہندوستان چلی گئیں۔ مختصراً ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے جو کچھ اوپر عرض کر دیا گیا ہے۔ کافی ہے۔ ایک فنکار کا فن اُس کی شخصیت کا نغمۂ بے آواز ہوتا ہے۔

گزشتہ ۳۵ سال کے عرصے میں قرۃ العین کی تخلیقی جودت نے اُردو ادب میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اگر آفتاب نہیں تو ایک درخشاں مہتاب کا درجہ انھیں ضرور بخشتا ہے۔ آج افسانوی ادب کے میدان میں پاکستان و بھارت میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ قرۃ العین اس حقیقت پر اصرار کرتی ہیں کہ قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کے ناولوں میں ماضی و حال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں وقت ایک اکائی ہے اور وہ حال کو ماضی کے اثرات و عوامل سے الگ نہیں کرتیں۔

"آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہم سفر" اور "گردشِ رنگِ چمن" قرۃ العین کے ان تینوں بڑے ناولوں میں ماضی کا سفر حال کو روشن تر بناتا ہے۔ قرۃ العین کے فن کی انفرادیت کا امتیازی پہلو جو قارئین کو متاثر کرتا ہے اُن کا خوبصورت، رواں دواں اور شائستہ نثری اُسلوب ہے جس میں چستی ہی نہیں، تہہ داری اور تنوّع بھی ہے۔ ان کی تحریر میں انسان کی داخلی خود کلامی اور شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ الفاظ کی ایمائی قوت سے ماحول کی تخلیق بھی کرتی ہیں اور واقعیّت کا رنگ بھی ابھارتی ہیں۔ لیکن اس عمل میں اظہار کی سطح پر ایک خوشگوار تازگی و نغمگی اور نشاط آفرین شگفتگی قائم رہتی ہے۔ "آگ کا دریا" سے صرف ایک مثال ملاحظہ ہو: یہ وہ منظر ہے جب گوتم نیلمبر عہدِ چندر گپت میں اپنے پہلے وجود کے ساحل پر پہنچ چکا ہے۔

"تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا۔ اس لڑکی نے کیسری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے۔ اس نے پوچھا "کچھ جانتی ہو۔ ندی کے اُس پار کون رہتا ہے؟"، "کچھ بھکشو لوگ رہتے ہیں۔" لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ "وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔"

"تم اُسے جانتی ہو؟"

"میں اسے جان کر کیا کروں گی؟" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا میں ذرا اُن سے مل آؤں۔"

"ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔"

"کیا حرج ہے۔ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔"

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلاتے تھے۔ بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔ اُس نے جھک کر پھول کو اُٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی

میں کُود پڑا اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔
اتنے میں پانی کا ایک زور دار ریلا آیا جس کے تھپیڑوں سے وہ کِنارے کے قریب پہنچ گیا۔ مگر اب پانی کی لہریں اُونچی ہوچکی تھیں، اُس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ مگر پانی میں اُس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اُسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حِصّہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اُس نے جلدی سے ایک لگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت ہی تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اُس نے ذرا کے ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اُسے ایک لحظہ کے لِیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پَل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔ سرجُو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اُوپر سے گزرتی چلی گئیں۔"

اس پورے نثر پارے میں معنی کی کئی سطحیں ہیں۔ فضا آفرین لفظوں میں ایک منظر کا بیان بھی ہے اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی جہاں رنگوں اور آوازوں، سکوت اور تحرک کا عجیب و غریب امتزاج ہے۔ پھر یہی الفاظ ایمائی اور علامتی لباس پہن کر قاری کے ذہن میں دوسرے نقوش جگاتے ہیں۔ گوتم صرف گوتم نہیں رہتا۔ وہ کائنات کی آغوش میں پلنے والا ایک جری انسان بھی ہے جو طوفانی ندیوں کو اس لیے پار کرتا ہے کہ وہ اس کی ہمت اور حوصلوں کو للکارتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر کی یکتائے روزگار شخصیت اور ان کی بے مثل ادبی صلاحیت صرف عطیہ فطرت نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ان کی برسوں کی محنت، ریاضت، تلاش و تحقیق اور تفکر رہا ہے۔ اپنے ناولوں کے لیے مواد کی تلاش میں انھوں نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں، کتب خانوں، پرانی حویلیوں کی خاک چھانی اور قدیم دستاویزوں کا مطالعہ کیا ہے۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت

قرۃالعین حیدر کے ہاں نِسائی حسیّت کا نیا رجحان ہے۔ اُن کے افسانے "یاد کی اِک دھنک جلے" کے ایک کردار کی داخلی خود کلامی ملاحظہ ہو۔

"اور میں نے سوچا کہ ہر جگہ مندروں، تیرتھ استھانوں میں، درگاہوں اور مزاروں کے سامنے گِر جاؤں اور امام باڑوں اور گوردواروں اور آتش کدوں ۔کہ اندر ...... یہ عورتیں ہی ہیں جو رو رو کر خُدا سے دُعائیں مانگتی ہیں۔ ساری دنیا کے سرد، بے حس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے دُھلتے رہتے ہیں۔ عورتوں نے ہمیشہ اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پر سر رکھا اور کبھی یہ نہ جاننا چاہا کہ اکثر یہ پاؤں مٹی کے بھی ہوتے ہیں۔ عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارنیں کیوں ہیں؟ اِس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔"

عورتوں سے ہمدردی کا یہ نقشِ رواں قرۃ العین کے دلِ گداز کا آئینہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کی انفرادیت کے اِدراک کے لیے دیگر ادیبوں کے فن پاروں پر نگاہ ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ بہت کم بڑے ادیب قرۃ العین کے مُقابل آتے ہیں۔ عزیز احمد نے اردو کو چند اچھے ناول دئیے ہیں مگر ان کا موضوعِ فن بہت محدود ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ہاں تاریخ کی وہ آگہی نہیں ملتی جو کسی دور کے ناول نگار کو اُس دور کی تہذیب کا مکمل ترجمان بناتی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے بلاشبہ "لہو کے پھول" جیسا اہم تاریخی ناول لکھ کر قرۃ العین کے مواد و موضوع پر بڑے بلند پیمانے پر دخل دیا ہے، لیکن ان کے یہاں وہ وُسعتِ نظر یا آفاقی تناظر نہیں جو قرۃ العین کے یہاں پایا جاتا ہے تقسیم ہند کے المیے پر عبد اللہ حسین کا ناول "اُداس نسلیں" یقیناً فنی طور پر قرۃ العین کے ناول "آگ کا دریا" کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر "آگ کا دریا" کا موضوع صرف تقسیمِ ہند نہیں بلکہ پوری انسانیت کا المیہ ہے جو تقسیم ہند کے تاریخی مرحلے پر رقم ہوا ہے۔ اسی طرح رتن ناتھ سرشار کا "معاشرتی مُرقع" قرۃ العین کی سماجی تصویروں کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ مرزا ہادی رُسوا کا پیمانہ ُفن بھی قرۃ العین کے مقابلہ میں بہت محدود ہے۔ راشد الخیری کے معاشرتی المئیے اور عورتوں کے ساتھ ان کی ہمدردی انہیں ایک جہت سے قرۃ العین کا پیشرو بناتی ہے، لیکن قرۃ العین کا المیہ اور ان کی ہمدردیُ نسواں محدود معنوں میں معاشرتی نہیں بلکہ زندگی اور انسانیت کے ایک آفاقی نقطۂ نظر کا حصّہ ہے۔ واضح رہے کہ قرۃ العین حیدر آج کی انسانیت کے درد و داغ اور جستجو و آرزو کی بہترین افسانہ خواں ہے۔ ان کی تحریروں میں بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے ہندوستان کی معاشرت کا قصیدہ بھی ہے اور نوحہ بھی یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ قرۃ العین کا افسانوی ادب علامہ اقبال کے پیامِ مشرق کے بعد دوسرا پیامِ مشرق ہے۔

قرۃ العین حیدر کی نثر سہلِ ممتنع کی طرح سادہ و سلیس ہے۔ وہ اپنے احساسات کا اظہار کر کے قارئین کو بلا تکلّف اُن میں شریک کر لینا چاہتی ہیں۔ اُن کے ادب کی جاذب اور خوشگوار مثالیں فراہم کرتی ہیں۔ کوئی بھی فنکار کسی مخصوص تکنیک کو شعوری طور پر زبردستی برتنے کی کوشش نہیں کرتا۔ قرۃ العین حیدر ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

"انسان جب لکھنے بیٹھتا ہے تو تکنیک سامنے نہیں رکھتا تکنیک آپ سے آپ بنتی ہے۔ نگارِش کی بلندی فنکار کے خیال کے قد سے مطابقت رکھتی ہے"

قرۃ العین کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" ہے۔ یہ نام بھی اپنی ایک علامت رکھتا ہے۔ اور اُس کا ایک حوالہ ہے۔

میرے بھی صنم خانے تیرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

(اقبال غزل، بال جبریل)

یہ ناول خود اظہاریت کی بہترین مثال ہے۔ اس کی مناسبت سے عنوانِ کتاب کے نیچے ماجرا کے تین مراحل اس طرح درج کیے گئے ہیں۔

(۱) تراشیدم (نوع کی طمانیت اور معصومیّت)
(۲) پرستیدم (خود شناسی و خودنگری)
(۳) شکستم (معاشرہ بکھر جاتا ہے)

اس ناول کا پس منظر ایک محیط طوفان ہے جس نے زندگی کے سارے آثار مٹا دیے ہیں۔ مستقبل کی تمام آرزوئیں تباہ ہو

چکی ہیں گزرے ہوئے وقت کے لمحات ضائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح یہ داستان ایک پوری نسل کا المیہ پیش کرتی ہے۔ یہ وقت کا ایک یاس انگیز تصور ہے ایک منظر دیکھیے:

"رخشندہ آتش دان کے پاس ایک پُرانے سُرخ رنگ کے میلے صوفے پر، جس کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس گئے تھے۔ اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے بیٹھی رہی اور پلکیں جھپکاتی رہی۔"

"سارا دِن گزر گیا اس نے پھر دُہرایا۔"

"دریچے کے باہر ہوائیں زرد پتوں کو ادھر سے اُدھر اُڑاتی ہیں"

"سارا دِن گزر گیا کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں آیا۔ سارا دِن گزر گیا" (ص ۵۶ - ۴۵۴)

سبھی فِقرے معنی خیز ہیں اُن کے اشارات سے افلاس، اُداسی۔ حُزن اور حسرت ٹپکتی ہے۔ "سارا دن گزر گیا۔" کی سطر سے بے اختیار فیض کی نظم تنہائی یاد آتی ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار، نہیں کوئی نہیں
اپنے بے خواب کواڑوں کو مُقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

ناول میں رخشندہ کی خود کلامی ایک نقش یاس ہے۔

"کون آتا ہے کسی سوختہ ساماں کے قریب"

اس ناول میں ہندوستان کے ایک خاص عہد کی مرقع نگاری کی گئی ہے۔ اور اس سے وابستہ مختلف موضوعات کے نقوش پیش کیے گئے ہیں۔

"یہاں کسی کو پتہ نہیں تھا کون ہندو ہے کون مسلماں، کون شیعہ ہے، کون سُنی۔ اپنے دُکھوں اور تکلیفوں کے باوجود زندگی بڑی مکمل، پر مسرت اور قانع تھی۔ پُرانی روایات کی پابندی اور قدیم چلن کا نبھانا سب کا مقدس فریضہ تھا۔" (ص ۳۶۷)

اِسی داستان میں وطنیت کا احساس محل نظر ہے:

"سب اِس دھرتی کے بیٹے تھے۔ اُن کی زبان اُن کا لب ولہجہ ان کے گیت، ان کے دکھ سکھ اور وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے یہ سب ان کا اپنا تھا۔ اپنی زمین کی بالیاں، ہوا کی نمی، مٹی کی خوشبو یہ سب ان کی اپنی مِٹی کے دیوتا تھے۔" (ص ۳۵۳)

اس ارضی تعلق کی جذباتیت اپنی جگہ لیکن فرقہ وارانہ فسادات نے آزادیٔ ملک کے تاریخی موڑ پر جشن کے شادیانوں میں نغمہ ہائے غم شامل کر دیے۔

"چراغ جھلملاتے رہے، ساز بجتے رہے، ملک بھر کے ان مرتے مارتے انسانوں کے لیے اتنے بہت سارے لوگ اپنے اپنے طریقہ سے جو کچھ کر سکتے تھے کر رہے تھے۔ اُن کے دلوں میں جذبہ تھا، خلوص تھا، دکھ تھا، بے انتہا شدت کا دکھ اور تکلیف۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں اس طرح نہ مرنے دو، زندگی بلند ہے، زندگی پاکیزہ ہے، زندگی مقدس ہے۔ خدا نے زندگی خون میں رگیدے جانے کے لیے تخلیق نہیں کی تھی، ساز تیزی سے بجتے رہے۔" (ص ۲۴۹)

اس ناول کی ماجرا سازی کی ایک جدّت یہ ہے کہ روائیتی انداز میں نہ تو پس منظر تیار کیا گیا ہے، واقعات کی کڑیاں ملائی گئی ہیں، نہ کرداروں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے بس ایک سلسلۂ خیال ہے جو نکلتا اور بڑھتا چلا گیا ہے۔ مختلف مناظر، متنوع نہ واقعات، متعدد کردار اور اُن کے دلچسپ مکالمات اور ساتھ ساتھ مصنفہ کے فکر انگیز تبصرے سامنے آتے ہیں۔ اسی ہیئت کو جدید تنقید کی اصطلاح میں شعور کی رو "STREAM OF CONSCIOUSNESS" کہا جاتا ہے۔ قرۃ العین اس داستان میں واشگاف بیانِ ماجرا کی بجائے ایمائیت سے کام لیتی ہیں۔ اور ہلکے ہلکے اشاروں میں اپنے تصورات پیش کرتی ہیں۔ اس فنکاری میں ایسی تازگی اور انفرادیت قرۃ العین کو اردو کے دوسرے ادیبوں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے۔

"ستاروں سے آگے" قرۃ العین کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو "میرے بھی صنم خانے" سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ان افسانوں کے ذریعہ سے نوجوان نسل کو خوابِ گراں سے جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی یہ عبارت قابل ملاحظہ ہے۔

"عالمِ کون و مکان (VERSUS) لامکان۔ اے طائرِ لاہوتی نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے ہوا میں معلق رہ۔ اسرارِ خودی پڑھو، رموزِ بیخودی پڑھو اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہو تو اقبال کا مطالعہ کرو۔"

(ص۔ ۱۱۴)

اس افسانوی مجموعے کے عنوان "ستاروں سے آگے کی نسبت علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(غزل بال جبریل)

اس طور پر ان افسانوں کا موضوع صُبح کی کرنوں کی مانند واضح ہے۔

از خوابِ گراں، خواب گراں، خوابِ گراں خیز!

"سفینۂ غمِ دل" قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا ماحول اور کردار بھی نوعیت کے اعتبار سے وہی ہیں جو پہلے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور افسانوں کے پہلے مجموعے "ستاروں سے آگے" میں پائے جاتے ہیں۔ اس ناول کا پس منظر انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی آفتوں کی داستان ہے۔ مثال کے طور پر یہ بیانیہ ملاحظہ کیجیے۔

"یہ کوئی تیز دھار چیز ہے جس نے روح کو بے حد گہرا کاٹا ہے۔ ہمیشہ کے لیے زخمی کر دیا ہے" (ص ۳۳۰)

"انقلاب ایک خواب تھا۔ ہم کس موت سے بچے۔ اب کون سی موت ہمارے سامنے ہے (ص ۳۶۴)

۱۹۵۴ء میں قرۃ العین کے بارہ افسانوں کا مجموعہ "شیشے کا گھر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی زندگی کے حُزنیہ پہلو کی غمازی کرتا ہے۔ اسی مجموعے کا ایک افسانہ "جہاں پھول کھلتے ہیں" مصنفہ کے مخصوص فکر و فن کی نشاندھی کرتا ہے۔ فلسفہ، فطرت و حُزن قرۃ العین کا سرمایۂ ذہنی ہے۔ وہ گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں کی بازیافت کو اپنا مقصدِ زندگی بناتی جارہی ہیں۔ اور چونکہ یہ ممکن نہیں ہے لہذا وہ ایک مستقل حسرت سے لذت اندوز ہو رہی ہیں۔

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کو جستجو

(اقبال ذوق و شوق، بالِ جبریل)

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے شاعرانہ اُسلوب کا تعلق ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غمِ دل" میں یہ انداز نمایاں ہے یہ مصنفہ کے ابتدائی ناول ہیں اور یقیناً اِن تحریروں میں جذباتیت اور شاعری زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے۔ بالخصوص "میرے بھی صنم خانے" کے کرداروں کے ذہن و جذبے میں رومانیت رچی ہوئی ہے۔ یہ سب کے سب اپنی بنائی ہوئی جنت میں محوِ گلگشت ہیں۔ اور جب ان کے خواب ٹوٹتے ہیں تو جذباتی ہو جاتے ہیں۔

"میرے بھی صنم خانے" کے اکثر پیرا گراف کے آخر میں اِس طرح کے رومانی جملے نظر آتے ہیں:

رات کی پرچھائیاں وادی پر پھیل گئیں اور ہوائیں چپکے چپکے روتی رہیں۔ جزیرے کے کنارے کنارے لہریں مارتا ہوا تاریک سمندر رات بھر روتا رہا۔ دوپہر کا خوشگوار سناٹا گہرا ہوتا گیا۔

ایک عمارت میں سے وائلن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

دونوں ابتدائی ناولوں میں اگرچہ شاعرانہ اُسلوب کا رنگ گہرا ہے لیکن اندازِ بیان ایک صاحبِ طرز ادیب کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ اور آگے چل کر "آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہمسفر" اور "کارِ جہاں دراز ہے" کی تحریروں میں شاعرانہ رنگ برائے شعریت نہیں رہا بلکہ جذبہ فکر میں گھلا ہوا ہے اور تحریروں میں رومانیت کے بجائے پختگی نظر آتی ہے۔ قرۃ العین نے اپنی تحریروں میں مخصوص الفاظ کے استعمال سے اپنی تحریروں میں علامتی کیفیتوں کو نکھارا ہے۔ دریا، روشنی، نغمہ، پھول، پرندے، رنگ، پودے، موسم، خوشبو، سناٹا، صدا، رات، چاند اور ستارے وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو اُن کی ہر تصنیف میں کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن اِن الفاظ کا استعمال قرۃ العین حیدر برائے شاعری نہیں کرتیں بلکہ اُن کے یہاں تمام الفاظ علامت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ رنگ محض رنگ نہیں، نغمہ صرف نغمہ نہیں اور دریا صرف بہتا پانی ہے بلکہ یہ وقت اور مخصوص قوموں، مخصوص جگہوں اور مخصوص زمانوں کی تہذیبوں کے استعارے ہیں۔ اور ساتھ ہی کرداروں کی ذہنی و جذباتی صورتِ حال کا اشاریہ بھی ہے۔ مثال کے طور پر:

"گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا۔ اُسے اِس جگہ کا نام نہیں معلوم تھا۔ قریب جولاہوں کی بستی تھی۔ صندل سے معطر ہوائیں اُمنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہرا نظر آرہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ کالی جامنیں ہری گھاس پر ٹپ ٹپ گرتی تھیں"

یہ شگفتہ اندازِ تحریر بہت کم ادیبوں کو نصیب ہُوا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول "آگ کا دریا" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس تصنیف سے قرۃ العین حیدر نے ایک علامتی تصویر اردو ادب کے نگار خانے میں آویزاں کردی ہے۔ مصنفہ کے دیگر ناول اور کثیر التعداد دیگر افسانے سب مل کر فن کی وہ فضا بناتے ہیں۔ جس میں ناول "آگ کا دریا" کی تخلیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دریا ایک مخصوص زمین پر بہتا ہے اور ایک خاص ہوا میں لہریں لیتا ہے۔ اُس کے سوتے کسی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں اور اُس کے دھارے کسی رُخ پر رواں دواں ہیں۔ ناول کے نام میں قرۃ العین حیدر نے یہ استعارہ جگر مراد آبادی کے حسب ذیل شعر سے لیا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا سمجھ لیجیے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

(شعلہ طور)

مصیبتوں اور آزمائشوں کے درمیان زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور کچھ پانے کا وہ احساس جو ناول کے ہیرو گوتم نیلمبر کو ہورہا ہے۔ حیات کے ارتقاء کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ناکامیوں میں کامیابی، محرومیوں میں شادکامی، مصیبتوں میں راحت کا احساس ہے۔ یہ عمل ناول کے ابتدائی حصے سے ظاہر ہے۔

"مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے۔ کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا۔ (ص۔۱۴۹)

قرۃ العین کے فن کو تاریخ سے مناسبت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اُنھوں نے تاریخ ہی کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے بعض فلسفیانہ خیالات کا استعمال کیا ہے۔ ان ہی خیالات سے کچھ علامتیں بھی بنائی ہیں۔ یہاں تک کہ گوتم نیلمبر کا کردار خود ایک انسان اور ایک ہندوستانی کی علامت بن گیا۔ لیکن گوتم نیلمبر، گوتم بُدھ نہیں ہے۔ وہ صرف ایک ہندوستانی ہے جس نے بدلتے ہوئے ادوار میں تہذیبی طور پر ہندو دھرم، اسلام، اور عیسائیت سبھی اثرات قبول کیے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت ہی مرکب اور دبیز شخصیت کا مالک ہے۔ وہ خود ایک مظہرِ فطرت ہے اور اس لحاظ سے خالق فطرت کی تجلی گاہ ہے۔ جس خوبی سے ناول نگار نے تقسیم ہند کے بعد کے حالات کا نقش کھینچا ہے۔ وہ ان حالات پر بھرپور گفتگو کے بعد منصور کمال الدین کے دیرینہ دوستوں گوتم نیلمبر اور ہری شنکر کے مکالمے کے بعد خاموشی میں نمایاں ہے۔ بعض خاموشیاں بہت باآواز ہوتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا وہ نقش محلِ نظر ہے۔

"وہ دونوں خاموش ہوگئے ہیں۔ سیڑھیاں اُتر کی وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا" (۷۸۴)

اس کیفیت کا تاثر اس شعر میں دیکھیے۔

ایک یہ ملنا ایک وہ ملنا
کیا تو مجھ کو چھوڑ رہا ہے

قرۃ العین حیدر کے باآواز خاموشی کے تبصرہ سے بڑھ کر تقسیم کے بعد مسلمانوں کے مقدر اور خود برِ صغیر کی عجیب و غریب تقدیر پر کسی اور ادب پارے میں دکھائی نہیں دیا۔ مصنفہ نے یہ الفاظ ہندو کرداروں کی طرف منسوب کیے ہیں اور اُن کے ذہن کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیے ہیں۔ بلاشبہ اِن الفاظ میں بے پناہ تلخی ہے مگر ان میں طنز سے زیادہ درد مندی ہے اس لیے جس پس منظر میں یہ الفاظ ادا کیے گئے ہیں وہ گوتم، ہری شنکر اور کمال الدین کی گہری دوستی اور بھائی چارے کا ہے۔ یہ دوستی علامتی طور پر ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کی مظہر ہے اور اس کے نتیجے میں صدیوں پر مشتمل ایک شاندار مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی ہے جس کی نقاشی پورے ناول میں کی گئی ہے۔ یہ ناول ایک داستانِ غم ہے۔ مگر قرۃ العین کی زبان کی مٹھاس اور اُسلوب کی حلاوت اس ناول میں بدستور موجود ہے۔ ناول "آگ کا دریا" قدیم ہندوستان کی تہذیب کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ اُسے اِس ناول کا پہلا حصّہ کہئیے۔ پھر اُس کے بعد منظر بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ مسلمان آتے ہیں جو اپنے ساتھ......

عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

لاتے ہیں۔ پھر انگریز آجاتے ہیں اور نیا ہندوستان سامنے آجاتا ہے یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہو جاتا ہے اور تہذیب کا عظیم دریا دو دھاروں میں بدل جاتا ہے۔ یہ ہے اس ناول کا سرسری خاکہ۔

اِس ناول کے پیچھے ایک قوی چیز اُبھرتی ہے وہ یہ کہ قرۃ العین کی نظروں میں سب سے بڑی قدر "دوستی" ہے۔ اُن کے تمام کردار ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یا دوست کی تلاش میں ہیں۔ دوست یا دوستی کی تلاش اس ناول میں شاید زندگی کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے اصل ناول درحقیقت تیسرے حصے سے شروع ہوتا ہے جہاں دوستی پھیلتی ہے اور محبت خواب دیکھتی ہے۔ قرۃ العین لکھنؤ کی تہذیب کا بہار آفریں نقش پیش کرتی ہیں۔ لکھنؤ جو باغوں اور خوابوں کا شہر ہے جہاں شام ہوتے ہی گلیاں پھولوں کے ہار کی خوشبو سے بس جاتی ہیں اور پورا شہر عطرِ فردوس میں نہا اُٹھتا ہے قرۃ العین جب جانِ بہار لکھنؤ کو پیش کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی تمام عظیم تہذیبوں کی طرف سے بول رہی ہیں۔ نفرتوں اور عداوتوں میں ڈوبی ہوئی دنیا کی طرف وہ انسانی محبت، امن اور آشتی کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد فسادات میں محبت کے گلستاں ویران ہو گئے۔ ہندوستان کی تہذیب اپنے ہی لہو میں نہا گئی۔ قرۃ العین نے اسی ویرانی کا نوحہ کہا ہے۔ اس نوحہ خواں کی المیہ نگاری اپنی نظیر آپ ہے۔ قرۃ العین نے اپنی تصنیف "آگ کا دریا" کے ذریعے اُردو ناول کی تاریخ میں اپنا ایک اِمتیازی مُقام حاصل کیا ہے۔ جہاں تک اِس ناول کی مقبولیت کا تعلق ہے اُس کی وجہ خالص عمرانی اور نفسیاتی ہے۔ تقسیم ہند نے پوری ہندوستانی تاریخ کو سرحد کے دونوں طرف تمام تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا دیا تھا اور باشعور افراد اپنی جڑوں کی تلاش کرنے لگے تھے۔ خاص کر نئی نسلوں کا دماغ سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک مشترک تہذیبی ورثہ کے منقسم ہونے کا احساس بھی شدید تھا۔ اِسی عالم میں "آگ کا دریا" وقت کی ایک چیز بن کر اُردو پڑھنے والوں کے سامنے آیا اور اپنے پریشان کُن ذہنی سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اِس ادب پارہ کے سوز و گداز نے اُن کے رگوں میں گھر کر لیا۔ "آگ کا دریا" ایک تاریخی معنویت لیے ہوئے ہے۔

تقسیم ہند کے بعد واردات کا تاثر جگر مُراد آبادی نے اپنے اِن اشعار میں پیش کیا ہے۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے اِن دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

میری دانست میں قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" جنابِ جگر کی متذکرہ غزل کا مقطع ہے۔ قرۃ العین حیدر دورِ جدید میں اُردو فکشن کی سب سے زیادہ مترنم اور سب سے زیادہ تخلیقی شخصیت کی مالک ہیں۔ میں نے مِس عینی کو تخلیقی شخصیت اِس لیے کہا ہے کہ اظہارِ شخصیت صرف سیرت میں ممکن ہے۔ اور شخصیت کسی انسان کی خودی کا اظہار ہے۔ جس میں شخصیت نہیں وہ شخص بھی کچھ نہیں۔ مِس عینی کی انفرادیت کی تشکیل اِسی سے ہوئی ہے۔ اظہارِ شخصیت فرض کی بجاآوری پر ہے۔ انھوں نے اُردو فکشن کو اس طرح لکھا جس طرح کوئی اپنا فرض ادا کر رہا ہو۔ ہمیں زندگی میں ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے اعمالِ فاضلہ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں لیکن مشاغلِ حَسَنہ اُن کے لیے امتیاز کا باعث نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس قرۃ العین کو پڑھ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کی روشنی میں، دِل آسائی اور گراں مائیگی ہم میں سرایت کر رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ابتداء میں افسانے، پھر ناول اور ناولٹ لکھے۔ سطورِ بالا میں اُن کے افسانوں اور ناولوں کا ذکر آیا ہے۔ اُن کی بہترین ناولٹیں "ہاؤسنگ سوسائٹی"، "دُلربا"، "اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو"، "چائے کے باغ"، "رَوشنی کی رفتار" اور "ستمبر کا چاند" ہیں۔ یہ درست ہے کہ جو شہرت "آگ کے دریا" کو ملی اُن کی کوئی اور تحریر اُس شہرت کو تو نہ چھو سکی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "گردشِ رنگِ چمن" اور "چاندنی بیگم" کے مطالعہ کے بغیر اُن کے ناولوں کا مطالعہ ادھورا ہی سمجھا جائے گا۔ قرۃ العین حیدر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اُن کا فن "کھوئے ہوؤں کی جستجو" ہے۔ برصغیر کی تاریخ کا وسیع کینوس ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے۔ بالخصوص تاریخ کا وہ حصّہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور اُن کی آمد سے جو نیا تہذیبی دھارا پھوٹا اور دریا بن گیا۔ اِس تاریخ کو فکشن کے توسط سے جس طرح قرۃ العین نے پیش کیا اُس کی دوسری مثال اردو ادب میں نہیں ہے۔

ایک اور مسئلہ بھی اُن کے پیشِ نظر رہا ہے۔ وہ ہے وقت۔ وقت کیا ہے کیا وقت ایک جبر ہے؟ کیا انسان وقت کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے؟ کیا وقت کو تقسیم کیا جا سکتا ہے نہیں۔ وقت ایک تسلسل ہے اور اِس سِلسلۂ روز و شب سے نجات ممکن نہیں۔ دریا جب اپنے منبع سے نکلتا ہے تو اس کی رفتار کچھ اور ہوتی ہے، پہاڑوں سے نکلے، میدان میں آئے تو کچھ اور، اِس سفر میں گھاٹ اور چاندی کے تاروں جیسی لہروں میں ڈوبتا اُبھرتا چاند۔ جنگل، خوشبو، پھول، بیلیں، وہ لوگ جو سفر کے دوران ملتے ہیں اُن کے پیارے چہرے، اُن کا زندگی سے پیار، اور پھر کائناتِ دل، کسی کو چھو لینے، پالینے کی تمنا، نئے نئے تجرباتِ دِل و دماغ میں کیسے کیسے بت بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ازل سے انسان خواہشوں اور آرزوؤں کی گزرگاہ پر چل رہا ہے۔ وہ اُداس، تنہا، مصائب سے پُر سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ "آگ کا دریا" مہاتما بُدھ کے زمانے سے شروع ہو کر ۱۹۵۸ء تک آگیا۔ ہر صفحہ پر قرۃ العین حیدر کا ڈِکشن بدلتا چلا جاتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ، تہذیب کی کونسی ایسی جلوہ سامانی ہے جو اِس میں نہیں غزل کی نرمی اور نزاکت، غزل جو ہماری تہذیب ہے اس کی تمام تر لطافت اِس ناول میں موجود ہے۔ وہ تہذیب جس کی خوشبو کو آج تک کوئی چھین سکا ہے نہ مٹا سکا ہے۔

"کارِ جہاں دراز ہے"، یہ ناول محض سوانحی نہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعی یادداشت سے تعلق رکھتا ہے اور چار ہزار سال کے

عرصہ پر مُحیط ہے۔ طویل افسانہ "ہاؤسنگ سوسائٹی" کے موضوع سے پاکستان میں نو دولتیوں نے جو استحصالی معاشرہ بنایا ہے اس کے تضادات کو اور بے رحمیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ "چائے کے باغ" میں وہ مرحوم مشرقی پاکستان میں محنت کش عوام کے استحصال کو بیان کرتی ہیں۔

"اگلے جنم موہے بِٹیانہ کیجیو" میں معاشرہ میں عورتوں کا جو استحصال ہوتا ہے۔ اُسے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور پہلی بار نچلے طبقے کے معمولی کرداروں کو مرکزی حیثیت دی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے آپ افسانے پڑھیں یا ناول اُن میں اُس داخلی اِضطراب کا حال ملے گا۔ جو انسان کا مقدر ہے۔ اُس آشوبِ ذہنی سے آپ دوچار ہوں گے جس سے انسانیت اور انسان دونوں احساسِ تنہائی میں مُبتلا ہیں۔ اُنھوں نے تکنیک اور موضوع کو اِس طرح آمیز کیا ہے کہ داخلی تجربے کو، ماورائیت کے رجحان کو تخلیقات کا اہم ترین جز بنالیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ "آگ کا دریا" کے کردار اُن معنوں میں کردار نہیں ہیں جیسے اُنیسویں صدی کے انگریزی ناولوں کے کردار ہیں۔ بلکہ اس ناول کے کردار علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں لیکن سب سے اہم کردار "وقت" ہے۔ زمانہ جو تخلیق کرتا ہے اور بگاڑتا ہے۔ T . S . ELIOT اپنی ایک نظم میں سوال کرتا ہے:

"خاتمہ کہاں ہے بے آواز چیخوں کا، خزاں میں خامشی سے مرجھائے ہوئے پھولوں کا؟
لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا۔ لوگ
بدل جاتے ہیں، مسکراتے بھی ہیں مگر کرب کبھی ختم نہیں ہوتا"

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ برِصغیر پاک وہند کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ و تہذیب کو اِس ناول میں بیان کیا گیا ہے اور یہ تاریخ و تہذیب اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ زمان و مکان کی وُسعتوں کا اِحاطہ کیے ہوئے ہے اور اِس خطے کے رہنے بسنے والے انسان کی داخلی اور خارجی دنیا کی تمام تر حشر سامانیاں اس ناول میں موجزن نظر آتی ہیں۔ تاریخی اور عصری آگہی کا گہرا شعور اور زبان میں تمام فنی خوبیاں، غزل کی باریک بینی اور نظم کی لطافت قرۃ العین حیدر کا اُسلوب ہے جواب تک اُردو زبان کا کوئی فِکشن لکھنے والا نہیں حاصل کر سکا ہے۔

قدیم شعرا، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف

غزل نما

جس کو محترمہ ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور مطالعے کے بعد ترتیب دیا
طلبہ اور ریسرچ اسکالر دونوں اس سے مستفید ہو سکتے ہیں
قیمت =/۱۰۰ روپے
شائع کردہ
انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

لکھاری اور قاری کا رشتہ

پروفیسر اکبر حمیدی

لکھاری سے میری مراد یہاں ادیب اور شاعر ہیں اور قاری ان کے لکھے ہوئے کو پڑھنے والے کا نام دوسرے بنیادی رشتوں کی طرح لکھاری اور قاری کا رشتہ بھی بہت پرانا اور مضبوط ہے۔ یہ رشتہ جتنا مضبوط ہوگا معاشرہ اتنا ہی تعلیم یافتہ اور صحت مند ہوگا۔ اور جب کہیں یا جہاں کہیں یہ رشتہ کمزور ہو جائے گا تو پھر وہ صورتِ حال پیدا ہوگی جس کا ذکر اکبر الہ آبادی نے کچھ ان الفاظ میں کیا:

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
شہر میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

سو یہ بات طے ہے کہ جہاں مضموں نہیں چلتا وہاں جوتا چلتا ہے ہمارا معاشرہ بحیثیت مجموعی پڑھا لکھا بھی ہے اور ان پڑھ بھی اس لیے مضمون بھی چلتا رہتا ہے اور جوتا بھی۔ اس نیم خواندہ معاشرے میں یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہو رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے اربابِ بست و کشاد کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ لوگوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے ان کی زیادہ توجہ اپنی ذات پر مرکوز رہی۔ پھر بھی لوگوں کی ہمت ہے کہ وہ تعلیم سے کچھ فیضیاب ہوتے رہے۔

ادب پڑھنے کا زیادہ رجحان ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ معاشروں میں فروغ پاتا ہے پھر بھی یہ بات بہت غنیمت ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر سطح پر ادب ہمیشہ پڑھا جاتا رہا ہے اور اسے پڑھنے کی ضرورت کا ہمیشہ احساس رہا ہے۔ چنانچہ ہم صورت حال دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی تعلیم کافی حد تو کچھ ایسا نہیں بڑھا لیکن ادب کے قاری کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہا۔ اس بات کی تصدیق شائع ہونے والی ادبی کتابوں کے اضافے سے بھی ہوتی ہے اور ادب کی دیگر فتوحات سے بھی۔ یوں ہمارے ہاں لکھاری اور قاری کا رشتہ ہمیشہ اور ہر سطح پر نہ صرف بحال رہا ہے بلکہ مضبوط سے مضبوط تر بھی ہوتا رہا ہے۔

ادب یقیناً پڑھا جا رہا ہے اور خاصا پڑھا جا رہا ہے! ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ گھروں میں، لائبریریوں میں، پارکوں میں دورانِ سفر ریل گاڑیوں میں، ذاتی اور عوامی سواریوں میں طویل سفر کے دوران ہوائی جہازوں میں بلکہ جہاں کہیں انھیں فرصت ملتی ہے وہ کتابوں۔ ادبی اور نیم ادبی رسائل و اخبارات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے تقریباً تمام اردو روز نامے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ روز ناموں کے جمعہ میگزین اپنی تکمیل کے لیے جمعہ میگزین میں ادب شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انگریزی روز نامے تقریباً سبھی اور بعض ہفت روزہ رسالے بھی جو معاشرتی یا سیاسی قسم کے مضامین چھاپتے ہیں اور ان کا عمومی مزاج بھی یہی ہے ہر شمارے میں ادبی تحریریں شائع کرتے ہیں یا پھر ادبی کتابوں پر تبصرے شائع کرتے ہیں۔ ماہوار ڈائجسٹ

غزلوں، نظموں، افسانوں، انشائیوں اور سفر ناموں یا پھر ادبی تقریبات کے ذکر سے بھرے ہوتے ہیں۔ بعض فیشن میگزین بھی ادبی تحریریں شائع کرتے ہیں اور اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی تشفی کرتے ہیں سارے منظر نامے کو دیکھتے ہوئے یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ادب نہیں پڑھا جارہا ہے یا لکھاری اور قاری کا رشتہ کمزور پڑتا جارہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمام رسائل و اخبارات اپنی اپنی پسند اپنے اپنے مزاج اور اپنے اپنے قارئین کی ضرورت کے مطابق ادب شائع کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ادبی کتب بھی پہلے سے کہیں زیادہ شائع ہو رہی ہیں اور کہیں زیادہ بک رہی ہیں۔ بعض کتابوں کے کئی کئی یا دو دو ایڈیشن تو عام طور پر شائع ہو رہے ہیں۔ لکھاری اور قاری کے رشتے کو کئی سطحوں پر محسوس کیا جارہا ہے۔ ناشروں کی کوٹھیاں کتاب اور قاری جیسی بنیادوں پر ہی تعمیر ہو رہی ہیں۔

ہمارے ہاں جس طرح لکھنے والوں کی درجہ بندی ہے اس طرح پڑھنے والوں کی بھی درجہ بندی ہے۔ پڑھنے والوں میں نچلے درجے کا ذہن، متوسط طبقہ۔ پھر متوسط طبقہ۔ پھر پڑھا لکھا قاری اور پھر بہت پڑھا لکھا اور صاحبِ رائے قاری موجود ہے۔ ظاہر ہے ہر کوئی اپنی صلاحیت، مزاج اور پسند کا ادب پڑھتا ہے لیکن یہ بات میں اپنے تجربے کی بنیاد پر بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہر سطح کا قاری لکھاری کو نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ ذاتی سطح پر رسپانس بھی دیتا ہے اور اپنے لکھاری سے ذاتی تعلق بھی قائم کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے ہاں جس قدر پروجیکشن ایک کھلاڑی کو ایک اداکار کو ایک سیاست دان کو دی جاتی ہے اگر اسی قدر پروجیکشن ٹی وی ریڈیو پر یا روز ناموں میں شاعروں، ادیبوں کو دی جائے تو عوام و خواص کے ہیرو پانچ دس سال کھیلنے والے نیم خواندہ کھلاڑی یا اداکار نہ رہیں بلکہ ملک کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا طبقہ شاعر اور ادیب عوام کا ہیرو ہو۔ جن کی تحریریں صدیوں تک نہ سہی سو پچاس برس تک تو اکثر زندہ رہتی ہیں۔ بڑے لکھنے والوں کی تخلیقات تو صدیوں تک پھیلی ہوتی ہیں اور آنے والی نسلوں کو روشنی اور روشن دماغی عطا کرتی ہیں۔

ادب کا قاری ایک بے اختیار طبقہ ہے وہ اپنے محبوب لکھاری کو خاموشی سے پڑھ سکتا ہے۔ پسند کرسکتا ہے۔ اس سے محبت کرسکتا ہے۔ اسے خطوط لکھ سکتا ہے لیکن معاشرے میں لکھاری کی بالادستی کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتا...... شاید اس لیے کہ وہ ادب ہی کے حوالے سے دیکھ رہا ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ ادب تو طوطی کی آواز ہے اسے سننے کے لیے پُرامن اور پُرسکون فضا کی ضرورت ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قومی سطح پر یا مجموعی طور پر ابھی ہم نے ذہنی زندگی بسر کرنی شروع نہیں کی۔ ابھی ہم جسمانی زندگی ہی بسر کر رہے ہیں جو ایک حیوانی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ہمارے معاشرے میں ابھی وہ عزت نہیں ہے جو ذہنی زندگی کی نشوونما کے لیے کام کرنے والوں کی ترقی یافتہ ممالک میں ہوتی ہے ان میں شاعر، ادیب، اساتذہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ہمارے ہاں محلّے میں ایک پروفیسر کی وہ عزت نہیں ہے کہ جو اسی محلّے میں ایک تھانیدار کی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود ادب اور ادبی کتب کی جس طرح پذیرائی ہو رہی ہے وہ حوصلہ افزا ہے۔ ادبی رسائل تو ایک طویل عرصے سے روشن خیالی۔ خرد افروزی اور لوگوں کی تہذیب کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور آج جس حوصلہ افزا صورت حال کو ہم محسوس کر رہے ہیں وہ ادبی رسائل اور ان کے مدیران کی طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے...... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے **الیکٹرانک میڈیا** خصوصاً پاکستان ٹیلی ویژن نے ادب کو جس بے رحمی سے نظر انداز کیا ہے اور اہلِ قلم سے جس طرح **سوتیلی ماں جیسا سلوک** کیا ہے وہ انتہائی طور پر افسوس ناک ہے یوں لگتا ہے جیسے ادب کو حزبِ اختلاف سمجھ لیا گیا ہے اور اس کا مکمل طور پر **بلیک آؤٹ کر دیا گیا**

ہے!

رسد اور طلب کا ایک عالمگیر اصول ہمیشہ سے رائج ہے۔ ادبی کتابوں کا زیادہ شائع ہونا اور تقریباً سبھی طرح کے اخبارات و رسائل کا ادبی تحریریں شائع کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ادب کا قاری بڑی تعداد میں موجود ہے اور ادب اس کی ضرورت ہے جسے پورا کرنے کے لیے ادب شائع کیا جاتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحبِ رائے قاری تعداد میں بہت کم ہے۔ زیادہ اور بڑی تعداد نیم خواندہ یا خواندہ قاری کی ہے۔ پڑھے لکھے اور ذہین قاری کی تعداد میں اضافہ لکھنے والوں کا بھی ایک مسئلہ ہے معاشرے میں ادب کی بالادستی اُسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب شاعر ادیب اپنے کام پر مزید توجہ دیں۔ اعلیٰ درجے کی تخلیقات کی تعداد میں اضافہ کریں اور چھوٹی چھوٹی واہ واہ پر خوش ہو کر اسی پر قناعت نہ کر لیں۔ ادب لکھنا ایک بڑا کام ہے اور بڑے کاموں کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے لکھنے والے کے لیے یہ سوال بے حد اہم ہے کہ وہ کس قاری کے لیے لکھ رہا ہے اسے یہ دیکھنا ہے کہ اگر اسے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو کس طبقے میں؟ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لکھاری اپنے عہد میں بہت مقبول ہوتے ہیں چند برسوں میں جب زمانہ آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ آج کے مقبول لکھاریوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ سستی اور آسان شہرت لکھنے والوں کا دل تو خوش کر دیتی ہے مگر بہت جلد ساتھ بھی چھوڑ دیتی ہے جس طرح ہمارے معاشرے میں راتوں رات امیر بننے کا رجحان پروان چڑھ گیا ہے اسی طرح شاعروں ادیبوں میں بھی راتوں رات شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جانے کی خواہش بہت ہو گئی۔ حفیظ جالندھری نے کہا تھا۔

تکمیل و تشکیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

ان دنوں اہلِ قلم میں اتنا مقابلہ لکھنے کا نہیں جتنا اپنے آپ پر لکھوانے کا ہے۔ بعض حضرات تو غیر ملکی سندیں بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک لکھاری کو اپنے قاری پر بھی نظر رکھنی چاہیے یہ بات اس کے بہت سوچنے کی ہے کہ اس کے لکھے ہوئے کو کون پڑھ رہا ہے؟ پڑھنے والے کا تعلق قارئین کے کس طبقے سے ہے؟ کیا اس کی تحریروں میں وقتی اپیل تو نہیں؟ کیا اس کی تحریریں صرف نوعمر اور غیر سنجیدہ قارئین تک تو محدود نہیں؟ کیا اس کی تحریروں میں روحِ عصر بولتی ہے؟ اور کہیں وہ زمین پر بیٹھ کر آسمانوں کی باتیں تو نہیں کرتا رہتا؟ کیا اس کی تحریروں کے وہی معنی برآمد ہو رہے ہیں جو اس نے قارئین تک پہنچانے چاہے ہیں یا پھر قاری کی مرضی ہے کہ اس کی چیستان کو جو معنی اس کا جی چاہے پہنائے؟ کیا اس کے لکھے ہوئے میں اس کی ذات شامل ہوئی ہے؟ کیا وہ وہی کچھ تو نہیں لکھے جا رہا ہے جو اس سے پہلے بہتر انداز میں لکھا جا چکا ہے؟ یا کوئی اس سے بہتر طور پر لکھ رہا ہے؟ کیا وہ محض اپنا پڑھا ہوا تو نہیں اُگل رہا؟ اس کے بات کرنے کا پیڈسٹل کیا ہے؟ کیا اس کی تحریروں میں اس کے ذاتی خیالات و نظریات (خواہ وہ ساری دنیا سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں ...... اور اگر ایسا ہے تو یہ بہت ہی اچھا ہے) اس کی اپنی واردات اس کے ذاتی مشاہدات اس کے وہ معاملات و مسائل جو دوسروں کے نہیں صرف اس کے اپنے ہیں اس کا شخصی مزاج ...... کیا یہ سب باتیں ہیں؟ میرے خیال میں ایک اچھے لکھنے والے کو لوگوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے لیے کوئی جزیرہ تلاش کر کے رکھنا چاہیے جہاں اس کی ذاتی رہائش ہو۔ اسے اپنی سوچوں اور اندازِ فکر کے اعتبار سے اکثریت کا نہیں اقلیت کا نمائندہ ہونا چاہیے تاکہ اس کے خیالات نادر ہوں اور اس کے اپنے ہوں!! عام خیالات اور عام جذبات کا ترجمان ہونا تو سمندر میں ڈوب جانے کے مترادف ہے!

یہ ایسی باتیں ہیں جن کے ذریعے ایک لکھنے والا اعلیٰ درجے کے قاری تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ ایسے قاری تک جو صاحبِ رائے ہے اور جس کی رائے کو وقار بھی اور دوام بھی حاصل ہے!!

آج کے بہت سے مقبول شاعر ادیب بہت محدود ہیں۔ ایک دو باتوں ہی کو مختلف انداز میں بار بار کہے جا رہے ہیں۔ بعض ادب میں غیر ادبی چیک کیش کروا رہے ہیں۔ بعض نے سنسنی خیزی ہی کو ادب سمجھ لیا ہے حالانکہ ادب اور علم سنسنی پیدا نہیں کرتے ہیں۔ جو کسی نئی اور دلکش تصویر کو دیکھ کر ہمیں نصیب ہوتی ہے! جس طرح بڑے گلوکار کی آواز میں کئی آوازیں شامل ہوتی ہیں اسی طرح بڑے لکھاری کے مزاج میں کئی مزاج شامل ہوتے ہیں جو اس کی تحریروں کے کینوس کو وسیع کر دیتے ہیں اور تب وہ ہر طرح کے قاری کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے ایسے لکھاری ہی عظیم ادب تخلیق کرتے ہیں جو کروڑوں اور اربوں انسانوں تک پہنچتا ہے اور صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔

قہرِ عشق

ولیم شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلو بطرہ کا منظوم ترجمہ

اشاعت ثانی

شان الحق حقی

قیمت -/۱۲۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

چراغِ شناسائی

معروف ترک شاعر فواد باپرام اور غلو کی رباعیوں کا منظوم اُردو ترجمہ

مرتبہ: ڈاکٹر حنیف فوق

قیمت -/۳۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان

فاصلے دل کے

مصنف: تھامس وُلف
مترجم: قیصر امام گیلانی

ریل کی پٹری سے ذرا دور ایک خوبصورت سی بستی تھی۔ اُس بستی میں ذرا فاصلے پر سرسبز ٹیلوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ ان سرسبز ٹیلوں کے ایک گوشے میں وہ کٹیا تھی جسے سفید تختوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور جس کے دروازے پر ہرے رنگ کا پردہ جھولتا رہتا۔ وہ کٹیا اپنی صفائی، ستھرائی اور خوبصورتی کے اعتبار سے اپنے مکین کی سلیقہ مندی اور رکھ رکھاؤ کی منہ بولتی تصویر تھی۔

اس کٹیا کی بائیں طرف ہرا بھرا باغیچہ تھا۔ جس کے ایک گوشے میں طرح طرح کی سبزیاں اگی ہوئی تھیں اور دوسری طرف انگور کی بیلیں تھیں۔ اگست کے آخری دنوں میں جب انگور پک کر تیار ہوتے تو آس پاس کی فضا اُن کی خوشبو سے معطر ہو جاتی۔ چند قدم کے فاصلے پر سامنے کی طرف شاہ بلوط کے تین کہنہ سال درخت تھے جب گرمیوں میں اپنے صاف ستھرے دبیز سائے اور جانفزا ٹھنڈک کی وجہ سے باعثِ راحت و آرام تھے اور ان درختوں سے ذرا پرے رنگ برنگے خوشنما پھولوں کی باڑھ تھی جو اس پورے علاقے کو پُر فضا، معطر اور روح پرور بناتی تھی۔

عرصۂ دراز سے سلسلہ کچھ یوں تھا کہ ہر روز سہ پہر کے وقت دو بجکر چند منٹ پر دو شہروں کے درمیان چلنے والی لوکل ٹرین جب اس جگہ سے ہو کر گزرتی تو اس وقت وہ لمبی میل ٹرین دم بھر کے لیے اس بستی کے قریب رک کر متوازی پٹری پر رینگنے لگتی اور اس وقت تک اس میں اپنی ہولناک تیز رفتاری نہ آنے پاتی بلکہ بڑے ہی محتاط انداز میں ڈولتی ہوئی گزرتی رہتی۔ اس کی بھاری بھرکم بوگیاں ہچکولے کھاتی رہتیں جس کی وجہ سے مسلسل گڑگڑاہٹ کی آواز فضا میں بلند ہوتی رہتی اور آخر اس طرح ساری کی ساری ریل گاڑی وادی کے نشیب میں گم ہو جاتی۔

اگرچہ گاڑی حدِ نگاہ سے دور ہو جاتی تاہم دور سے ہی سہی اس کی رفتار کا اندازہ اس کے انجن سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں اور گونجدار کوک سے بہ آسانی لگایا جاسکتا تھا جو تھوڑے تھوڑے وقفے پر مرغزار کے اوپر پھیلتے نظر آتے اور بالآخر دور سے دور ہوتی ہوئی پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے سوا کچھ بھی سنائی نہ دیتا اور پھر بھری سہ پہر کا مکمل سکوت!

گزشتہ بیس سال سے ہر روز یہی ہوتا آیا تھا۔ جیسے ہی وہ ریل گاڑی اس کٹیا کے سامنے سے گزرتی، ڈرائیور بھاپ سے بجنے والی سیٹی کی ڈوری کھینچ دیتا اور ایک سماعت خراش کوک خموشی کے سینے کو چیرتی ہوئی فضا میں بکھر جاتی۔

اور حسبِ معمول جیسے ہی وہ اس کوک کو سُنتی اپنی کٹیا سے نکل کر دروازے پر کھڑی ہو جاتی۔ ہولے ہولے اپنا ہاتھ لہرا کر ڈرائیور کو خدا حافظ کہتی۔ اوائل میں جو بچی اس کے لہنگے سے چمٹی رہتی تھی اب بیس سال بعد وہ جوان ہو کر مکمل عورت بن چکی تھی اور اب ہر روز وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ بلا ناغہ دروازے پر آیا کرتی اور ہاتھ لہرانے کے عمل میں اپنی ماں کا ساتھ دیتی۔

اب جبکہ پورے بیس سال بیت گئے تھے اور اس کے اپنے بچے بھی جوان ہو کر بیاہے جا چکے تھے ڈرائیور کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے اور ملازمت کے بوجھ تلے دب کر وہ کھوسٹ ہو چکا تھا۔ مسافروں سے لدی پھندی اس طویل ریل گاڑی کو وہ انھیں جانے پہچانے راستوں پر بیس سال کے عرصے میں دس ہزار بار کھینچ چکا تھا۔ چار مرحلوں پر اس نے زبردست، غمناک حادثے بھی دیکھے تھے۔ پہلا حادثہ چھکڑے کا تھا جس پر ننھے ننھے، معصوم اور کومل بچے اسکول جا رہے تھے۔ دوسرا ایک آٹو موبائیل گاڑی کا تھا۔ تیسرا حادثہ اس پیدل چلنے والے کا تھا جو پٹڑیوں پر چلتے ہوئے پہیوں کے نیچے آ کر کچومر بن گیا تھا کیونکہ وہ بہرا تھا اور ریل گاڑی کی کوک سُن نہیں سکتا تھا۔ چوتھا المناک حادثہ اس شخص کا تھا جو دروازے کی ٹکر سے دور جا گرا تھا اور جس کی دلدوز چیخ آج بھی اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔ یہ سارے حادثے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور آج بھی اس کے ذہن میں نقش تھے۔

عمر کی اس منزل پر وہ تمام محنت و مشقت، رنج و راحت اور زیست کے نشیب و فراز سے ایک چابکدست انسان کی طرح واقف تھا اور ان کی چاپ اپنے سینے میں محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے بڑی دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیے تھے اور بلند حوصلگی و جوانمردی کا مظاہرہ کیا تھا اور اب جبکہ وہ بڈھا ہو چکا تھا عقل و شعور کے تمام رموز سے آشنا تھا۔

بہر حال حالات جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں اور وقت کا پہیہ اس کی ریل گاڑی کے پہیوں کے ساتھ چاہے جتنی تیزی سے گھومتا رہا ہو، وہ اس خوبصورت کٹیا اور ان خواتین کو نہ بھلا سکا تھا جو بڑی گرمجوشی سے، ہزار امنگوں اور حوصلوں سے ہاتھ لہرا لہرا کر روزانہ کے معمول کے مطابق اُسے خدا حافظ کہتی رہتی تھیں۔ یہ مسرت آگیں واقعہ اس کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا خوبصورت اور خوشگوار سانحہ بن چکا تھا جو تمام تر فکر و تردد اور ناگزیر حالات سے لاتعلق اس کے ذہن کو بالیدگی اور دل کو خوشگوار دھڑکن عطا کرتا تھا۔

اُس کے روزانہ کے معمول میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔ یہ تو اس کے ذہنی سکون کا ایک ناگزیر ذریعہ اور اس کی آسودگی کا ایک خوش کُن علاقہ تھا۔ اس کٹیا کا نظارہ اور ان خواتین کے لہراتے، خدا حافظ کہتے ہوئے ہاتھ اس کی یادوں بلکہ اس کی زندگی کا بے پناہ سرمایہ تھے۔ چلچلاتی دھوپ ہو یا کڑاکے کی سردی، موسلا دھار بارش ہو یا دھندلکا پھیلانے والا کہرا اُولا باری ہو یا اپریل کی سحر انگیز اور دل فریب خنکی، اس نے ہر موسم میں اس کٹیا اور اُن بے پایاں مسرت بخشنے والی خواتین کا نظارہ کیا تھا۔

اس چھوٹے سے گھر اور ان عورتوں کے لیے اس کے ذہن میں بڑے ہی دل فریب اور اپنائیت سے بھرپور خیالات اُبھرتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی دور دراز رہ کر اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کے بارے میں سوچتا ہو۔ اُس نے اس **کٹیا اور ان** خواتین کی زندگی کے بارے میں اپنی سوچ کے تانے بانے سے ایک پر کیف، ایک عجیب و غریب ہیولیٰ بنایا تھا اور یہ خاکہ، یہ ہیولیٰ اس کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی گہرائی میں محفوظ ہو چکا تھا بلکہ نقش ہو چکا تھا۔ بعض اوقات تو اسے **یوں محسوس** ہوتا جیسے وہ ان کی روز مرہ مشغولیات اور طرز زندگی سے بالکل ٹھیک اسی طرح واقف ہے جیسے وہ مدتوں ان کے **درمیان رہتا چلا** آیا ہو اور اُسے ہر آن اور ہر پل کی ذرہ ذرہ خبر ہو......!

اور وہ لمحہ اس کے لیے کس قدر خوش آئند اور پُر مسرت تھا جب اس نے پورے اعتماد اور خوش دلی **کے ساتھ فیصلہ کیا تھا کہ**

ایک دن جب اس کی ملازمت کے ماہ و سال ختم ہو جائیں گے اور وہ اپنی ملازمت کے فرائض سے سبکدوش ہو گا تو ان سے ملنے ضرور جائے گا۔ ان سے باتیں کرے گا ان کے قُرب کا احساس اس کے لیے کس قدر جاں لیوا تھا۔ وہ جو اس کی اپنی زندگی کا حاصل بن چکی تھیں!

آخر کار وہ دن بھی آہی گیا جب اُس نے ریل گاڑی سے اُتر کر اس بستی کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا جہاں وہ دونوں خواتین رہتی تھیں۔ اس کی ملازمت کے ماہ و سال ختم ہو چکے تھے اور اب ایک پنشن یافتہ ملازم کی طرح اس کی مشغولیات بھی ختم ہو چکی تھیں۔

اس لمحے وہ پُروقار انداز میں آہستہ آہستہ قدم دھرتا ہوا اسٹیشن سے دور درختوں کے سائے میں منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کا دل بے پایاں مسرتوں سے دھڑک رہا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے نہ جانے کیوں ہر شے پر ایک اجنبیت سی طاری تھی جیسے اس نے ان راستوں کو، ان درختوں کو اور دوسری چیزوں کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، اس کی گھبراہٹ، بے چینی اور بیقراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے خیالات پراگندہ ہو رہے تھے اور اس کے ذہن میں عجیب طرح کی الجھن اور ابتری پھیل رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا۔

کیا یہی وہ بستی ہے جہاں سے وہ (اپنی بیس سالہ ملازمت میں) دس ہزار بار گزر چکا ہے؟ یہی وہ مکانات ہیں جنھیں وہ اپنی ریل گاڑی کے دریچوں سے بارہا دیکھتا رہا ہے؟

اُس وقت یہ سب کے سب اُسے کس قدر نامانوس، اجنبی اور حیران گُن لگ رہے تھے جیسے وہ خواب کے عالم میں کسی نامانوس شہر میں گھومتا پھر رہا ہو۔ ہر قدم پر اس کی روحانی الجھن، تشویش، بے چینی، بیقراری اور اضطرار میں اضافہ ہو رہا تھا۔

فی الوقت وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا آبادی چھدری ہوتی جارہی تھی اور مکانات اِکا دُکا ہی نظر آرہے تھے۔ کچھ دور پختہ راستوں پر چل کر وہ ایک کچی پگڈنڈی پر اُتر گیا۔ اگرچہ کئی دوسری پگڈنڈیاں بھی ان پختہ راستوں سے نکلتی تھیں مگر اُسے اچھی طرح پتہ تھا کہ یہی وہ پگڈنڈی تھی جس پر وہ خواتین رہتی تھیں چنانچہ وہ اسی مانوس پگڈنڈی پر گرد آلود تمازت کے باوجود خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔

آخر کار ایک طویل راستہ طے کر کے وہ اپنے اس مطلوبہ اور جانے پہچانے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں نے گواہی دی کہ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ برسوں سے آنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ قد آور شاہ بلوط کے درخت بھی دیکھے جو اس گھر کے سامنے ایستادہ تھے وہی رنگ برنگے پھولوں کے تختے، وہی باغیچہ اور وہی باڑھ اور ان سب سے دور وہی چمکدار ریل کی پٹڑی۔

وہ اپنے خیالات کو تقویت بخشنے کے سے انداز میں اپنے آپ سے گویا ہوا۔

ہاں! یہی وہ گھر ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ انگنت بار گزر چکا ہے۔ یہی اس کے پر مسرت خوابوں کی دنیا ہے **لیکن اب** جبکہ وہ اپنے اس خطۂ خواب کو حقیقت میں **دیکھ رہا تھا**۔ اور وہ بہ نفسِ نفیس اس دیارِ کیف و مسرت میں **کھڑا تھا، اس کا ہاتھ** اس دروازے تک پہنچنے میں کیوں پس و پیش کر رہا تھا، **کیوں** لرز رہا تھا، یہ بستی، یہ سڑک، یہ زمین، یہ دروازے **اس کے لیے** کیوں اس قدر اجنبی بن گئے تھے جیسے یہ کسی بھیانک خواب کی سرزمین ہو۔ اب اس کے احساس پر اس **قدر الجھن، شک** و شبہات اور نا اُمیدی کے بادل کیوں منڈلا رہے تھے؟

بڑے رد و کد کے بعد وہ پھاٹک میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ کپکپاتے قدموں سے کیاری کا راستہ طے کرتے **ہوئے اس**

ڈیوڑھی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور جیسے بے خودی اور خواب کے عالم میں اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک مختصر سے توقف کے بعد اُسے کمرے میں قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازہ کھلا۔ اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔

اور اُس وقت ایک شدید کرب انگیز احساس کے تحت اس نے سوچا کہ اُسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک نظر میں پہچان لیا تھا کہ وہ جو اس کے سامنے کھڑی ہوئی اُسے مشکوک نگاہوں سے تکے جارہی تھی، وہی خاتون تھی جو ہزاروں بار ہاتھ لہرا کر اُسے خدا حافظ کہتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ سخت کھردرا، نحیف و نزار اور بھنچا ہوا تھا، اور اُفتادِ زمانہ کے دباؤ سے اس کے رخسار زرد، پھیکے اور جھریوں سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اُسے مشکوک، خوف وہراس اور متجسس انداز سے گھور رہی تھیں۔

اس کا لہجہ کس قدر غیر مانوس اور غیر دوستانہ تھا۔ اس خاتون کی تمام تر خصوصیات، بہادری، آزادی، گرم جوشی، انسیت اور حرکات وسکنات جنھیں فاصلے نے اس کے ذہن میں صورت گری بخشی تھی مسمار ہوچکے تھے۔

جب وہ اپنی آمد کی وضاحت کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کس لیے آیا ہے تو اس وقت اس کی اپنی آواز غیر حقیقی اور اجنبی لگ رہی تھی۔

تمام تر صبر و تحمل اور ثابت قدمی کے باوجود وہ اپنے آپ کو بد حواسی، پچھتاوے اور بے یقینی کی لہر سے بچا نہ سکا اور اس کی تمام تر اُمیدیں، آرزوئیں اور معصوم تصورات، بے غیرتی بن کر اسے اپنی نظروں میں گرا رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس خاتون نے جیسے قہراً جبراً گھر کے اندر آنے کی دعوت دی پھر بڑی تُرش روئی سے اپنی بیٹی کو آواز دینے لگی۔ تب اس نے بڑے کرب انگیز لمحات ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی بدصورت بیٹھک میں گزارے۔ وہ خود پر قابو پا کر ان دونوں خواتین سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ دونوں اُسے اکتاہٹ، جھنجلاہٹ، غیر یقینی، مشکوک اور پریشان کن انداز میں گھورے جارہی تھیں۔

آخر کار اس نے بڑے نامہذب طریقے پر ہکلاتے ہوئے انھیں خدا حافظ کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھاری قدموں سے نشیبی راستوں پر چلا جارہا تھا اور تھوڑی دور چل کر شہر جانے والی پختہ سڑک پر مُڑ گیا۔ اور تب اچانک اُس نے محسوس کیا کہ وہ بڈھا ہوچکا ہے۔ اُس کا دل جو کبھی جواں تھا، پُراعتماد تھا مگر اس وقت جبکہ وہ ریل کی پٹڑیوں کے درمیانی فاصلے سے اپنے اس تصوراتی منظر اور خود ساختہ "محل" کو دیکھا کرتا تھا۔

اس نے بڑے رنج و ملال اور بڑے کرب سے سوچا...... "وہ کھوئے ہوئے درخشندہ لمحات اور ان مناظر کی سحر کاری، تصورات کی وہ خوبصورت سی دنیا، اُمید و بیم کے وہ لمحات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گُم ہوچکے ہیں۔ وہ سحر آگیں لمحات شاید اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ جنھیں فاصلے نے جنم دیا تھا۔

بہ مشکل مسخ شدہ

مصنف: سموئیل بیکٹ
مترجم: ادیب سہیل

اے اُداسی الوادع
اے اُداسی خوش آمدید

تم چھت کے خطوط میں منقش ہو
تم اُن آنکھوں میں منقش ہو جنھیں میں پیار کرتا ہوں۔
تم تمام تر ضرورت نہیں
کیوں کہ انتہائی نادار ہونٹ تمھاری مُسکراہٹ کو رد کرتے ہیں۔

اے اداسی خوش آمدید

پیار اُن پیکروں کے لیے جو محبت کے قابل ہیں
محبت کی بے پناہ قوت پیار کے قابل ہے
اچانک ایک بے جسم عفریت کی طرح اوپر اُٹھتا ہے
سرِ امید کو شکست ہو گئی
اُداسی خوبصورتی کا ایک رُخ ہے۔

(THE IMMEDIATE LIFE, 1932)

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

کلیاتِ جنوں

بشیر احمد خاں جنوں

صفحات ۲۷۲ قیمت =/ ادعائے خیر

زیر اہتمام: بزمِ خلیق ادب پاکستان، ۱۱۰ قصبہ کالونی منگھوپیر روڈ کراچی

کلیاتِ جنوں جناب بشیر احمد خاں جنوں کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے موصوف کے دو مجموعے اور شائع ہو چکے ہیں۔ "صدائے جنوں" اور "افکارِ جنوں" یہ دونوں مجموعے مختصر تھے۔ کلیات نہایت جامع ہے۔ اس میں حمد، نعت، نظموں، غزلوں اور قطعات کے علاوہ بعض وہ اصنافِ شاعری بھی شامل ہیں جن کو شعراء بھلا چکے ہیں مثلاً غیر منقوطہ یا مہملہ اور صنف غیر لب بستی، اگرچہ ان دونوں اصناف کا صرف ایک ایک نمونہ جنوں صاحب نے پیش کیا ہے تاہم ان کی یاد کو تازہ کر کے انھوں نے اپنی قادر الکلامی کا واضح ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔ آج کل چونکہ ہر پرانی چیز سے لوگوں کو کراہت محسوس ہونے لگی ہے اسی لیے غالباً اُن کا پرانا رنگ دیکھ کر مقدمہ نگار نہایت دھیمے سُروں میں یہ کہہ کر گزرے ہیں کہ "مطالعہ کی کمی اور مزاج کی عجلت پسندی کی وجہ سے اُن کے کلام میں استادانہ شان پیدا نہیں ہوسکی۔ اور ساتھ ہی میاں کمال الدین کے الفاظ میں دیگر شعراء کے ساتھ اُن کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ شعرائے کرام نوجوانوں کو تسخیر کائنات کا درس دیں اور اپنی ادبی دنیا کو ملت سازی کے افکار سے ہمکنار کریں" تسخیر کائنات کی مبہم اصطلاح کو تو میاں کمال الدین جانیں البتہ ناچیز تبصرہ نگار پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ محترم جنوں صاحب کا کلام ملت سازی کے افکار سے نہ صرف عاری نہیں بلکہ پوری طرح مالا مال ہے۔ اس بات کا اعتراف خود مقدمہ نگار نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے اور اُنھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ نوجوانوں کو بلند پروازی، دعوت عمل اور دعوتِ انقلاب دینے کی سعی بلیغ کی ہے۔

یہ تو یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ محترم جنوں صاحب کا پورا کلام یکساں طور پر بلند معیار کا ہے لیکن یہ دعویٰ کسی اور شاعر کے بارے میں بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شہنشاہِ متغزلین میر تقی میر کے بارے میں تو شیفتہ کا یہ فقرہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ پستش بغایت پست و بلنداش بسیار بلند" اور اردو کے عظیم ترین شاعر غالب کے دیوان میں انتخاب کے بعد بھی ایسے شعر دکھائی دیتے ہیں۔

ہم سے کُھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

جب ایسے عظیم شعراء کے کلام میں رطب و یابس موجود ہے تو جنون صاحب کے کلام کو بے عیب کیسے کہا جاسکتا ہے۔ یقیناً بعض اشعار پر بلند معیار ہونے کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لیکن معاملہ کمی اور زیادتی کا ہے۔ خورد بینی جائزہ کے باوجود پست معیار کے اشعار بہت کم ملیں گے ورنہ اُن کا بیشتر کلام ابہام، اغلاق اور اہمال سے پاک ہے اور سادہ، صاف اور رواں ہے۔ خیالات میں کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں جس بات کو وہ حقیقت سمجھتے ہیں اُس کو نہایت واضح اور سلیس انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خود ایک شعر میں کہتے ہیں۔

سمجھا ہے جو زمانہ کو سمجھا رہا ہوں میں
دل میں جو ہے زباں پہ وہی لا رہا ہوں میں

اُن کے کلام میں تجریدیت اور ابہامیت کا شائبہ تک نہیں اسی لیے شاید ترقی پسندوں کے معیار سے فروتر ہو لیکن عام فہم ہونے کی بنا پر عوام کے لیے یقیناً مفید اور قابلِ قدر ہے۔ یہ اشعار کس قدر حقیقت پسندانہ ہیں:

ماحول اِس نہج پہ یہاں آگیا ہے آج
لب کھولنا بھی باعثِ جرم و سزا ہے آج
رسوا ہوئے ہیں دامن اسلام چھوڑ کر
بھائی جو ہے وہ بھائی کا دشمن ہوا ہے آج

شروع میں آئینۂ ازل کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے جس کی ابتداء حمد باری تعالیٰ سے ہوئی ہے۔ اُس کے بعد تخلیق آدم، نظام عالم کا قیام، انبیا علیہم السلام کی بعثت، تعمیر خانہ کعبہ، مسجد اقصیٰ، رسول کریم ﷺ کی بعثت، صحابہ کے کارناموں وغیرہ کا ذکر تفصیل سے دے کر پوری دنیا کی تاریخ نظم کر دی گئی۔ غرض کتاب زیر تبصرہ اُردو شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

چشمِ خیال

مقبول نقش

صفحات ۱۶۰ قیمت =/۱۵۰ روپے

اے۔ ۱۵/۹۰ گلشن مصطفٰے فیڈرل بی ایریا، کراچی

"نوشتہ" کے بعد مقبول نقش کا تازہ شعری مجموعہ "چشمِ غزال" میرے پیش نظر ہے۔ اس میں رباعی، قطعہ، ثلاثی اور ہائیکو جیسی شعری اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے اِن کی شاعرانہ مہارت نے اِن سب اصنافِ سخن کو خوش اسلوبی سے برتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی مقبول نقش کا نام ڈھاکے کی شعری محفلوں میں سنا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ ان کا کلام اپنا اعتبار قائم کرنے لگا۔ اور جلد ہی وہ سابق مشرقی پاکستان میں خوش وضع شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جانے لگے تھے۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے اپنے تعارفی کلمات بہ عنوان "نقشِ مقبول" میں لکھا ہے کہ "شاعری کو مقبول نقش نے حرزِ جاں سمجھا مگر اپنی ذات کا پرچم نہیں بنایا" فوق صاحب کے اِس قول سے واضح طور پر نقش صاحب کی اُفتادِ طبع ظاہر ہو جاتی ہے واقعی نمود و نمائش نے اُنھیں چھو کر نہیں دیکھا۔ سادہ، پر خلوص، اور بہر حال مگن رہنے والی اُفتادِ طبع! ان خصوصیات سے نقش صاحب کی

شاعری کیسے متصف نہ ہوتی۔ یوں بھی فن میں، فنکار کا جستہ جستہ ظہور ہوتا رہتا ہے۔

رباعی:

جب کام کوئی خیر کا کر جاتا ہے
دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے
بدکار بھی جیتا ہے بہ ظاہر اے نقش
اندر کا مگر آدمی مر جاتا ہے

****

قطع:

اے نقش اِسے محسوس کیا ہے میں نے
افکار کی ضو، روحِ نوا کی صورت
شاید درِ تاثیر کی دستک ٹھہرے
ہر شعر مرا، حرفِ دعا کی صورت

****

ثلاثی:

یا ابھی دن تھا ابھی شام ہوئی
وقت کی تیزیٔ رفتار بھی نقش
یادِ یارانِ سبک گام ہوئی

****

ہائیکو:

کیسے ہوتے ہیں
وہ موسم جب آنکھوں میں
خواب اُترتے ہیں۔

کتاب اچھی چھپی ہے دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

(ا۔س)

میں زندہ ہوں

محمد ایوب واقف

صفحات ۱۹۲ قیمت =/۶۰ روپے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی

محمد ایوب صاحب کی تازہ کتاب "میں زندہ ہوں" بڑی افادیت کی حامل ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اُسے کتابی شکل میں چھاپ کر تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ اس کی قدر و قیمت کا تعین آنے والا زمانہ کرتا رہے۔

کتاب میں مصنف کی نامکمل خود نوشت کے علاوہ آل احمد سرور پر اُن کی کتاب "خواب باقی ہیں" کی وساطت سے لکھا گیا ہے اور لکھنے کا حق ادا کیا گیا ہے ایک مضمون "غزل، مشعل جاں اور مجروح" جناب مجروح سلطان پوری کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ واقف صاحب کا یہ اخذِ نتیجہ کہ مجروح ایک میڈیو کر شاعر ہیں، فیض احمد فیض کے ساتھ اُن کا موازنہ، فیض کے ساتھ زیادتی ہے۔ بہت حد تک درست ہے۔

بنگلہ زبان کے عہد ساز شاعر نذر الاسلام پر واقف صاحب کا مضمون بڑی محبت و عقیدت سے رقم ہوا ہے۔ نذر الاسلام پر یہ قول صادق آتا ہے کہ وہ ایک وہبی شاعر تھا۔ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں بنگال اور بنگال سے باہر کے نوجوانوں کو جس قدر حریت کا درس نذر الاسلام سے ملا اُتنا کسی اور شاعر سے نہیں ملا۔ یہاں اس حوالے سے مہا کوی رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ قول بھی یاد آتا ہے کہ جب کسی نے ٹیگور سے نذر الاسلام کی شاعری کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ جہاں میری شاعری ختم ہوتی ہے وہاں سے نذرل کی شاعری شروع ہوتی ہے۔ اس کی شاعری میں بنگال کے انقلابیوں کا دل دھڑکتا ہے۔"

ٹیگور کے گھر میں نذرل کی قدر دانی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اِن کی غالباً پتنی بدروہی کوی نذرل کی تصویر ایک طاق میں سجا کر ہر صبح پوجا کرتی اور پھول کا ہار پہناتی تھیں۔

ظ۔ انصاری کا ذکر بھی بڑی محبت سے کیا گیا ہے، واقف صاحب نے جو اُن کے سلسلے میں ذیلی عنوان "بڑی وسعت ہے میری داستاں میں" لگایا ہے وہ بھی اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ظ۔ انصاری کا فن جہت اندر جہت ہے۔ واقف صاحب کے اس مضمون میں ظ۔ انصاری کی طبیعت کی خوبیاں بہ مرور ظاہر ہوتی چلی گئی ہیں۔

عصمت چغتائی کے باب میں ان کا لب ولہجہ اس طرح کا ہے جس میں کہیں کہیں وہ خود پارٹی بن گئے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اس سے واقف صاحب کی طبیعت کا وہ رُخ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے موقف کو بے جھجک بیان کرسکتے ہیں۔

اُن کی نامکمل خود نوشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک SELF MADE فرد ہیں، ایسا شخص زمانے کا سرد و گرم چشیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاں تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے صداقت بیانی کے ساتھ کہیں کہیں لہجے میں درشتی بھی آجاتی ہے تو وہ بھی برنائے خلوص ہوتی ہے۔

اس خود نوشت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ واقف صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں دو دیسنوی حضرات، سید صباح الدین عبد الرحمن اور سید نجیب اشرف ندوی کی شفقتیں کار فرما رہی ہیں۔ جس کا اعتراف انھوں نے فراخ دلانہ انداز میں کیا ہے۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی "میں زندہ ہوں" میں شامل تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ اور ان کی مخاطب شخصیات کے کچھ نئے گوشے واضح کرتے ہیں۔

(ا-س)

ادب اور روایت

جمال پانی پتی

صفحات ٢٥١ قیمت = /١٢٠ روپے

المدثر اکیڈمی۔ سی ١٢، بلاک ١٧ فیڈرل بی ایریا، کراچی

میں یہ پہلے ہی کہہ دوں کہ جمال پانی پتی کی کتاب "ادب اور روایت" ادب میں ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے

اس میں دو طرح کے مضامین شامل ہیں کچھ شخص و عکس کے زمرے میں آتے ہیں اور کچھ کا تعلق فکر و فلسفہ سے ہے۔ اوّل الذکر میں بابا ذہین شاہ تاجی کی کتاب "آیات جمال"، جمیل الدین عالی کے دوہوں کے اذکار، سلیم احمد کی کتاب "چراغ نیم شب" عزیز حامد مدنی کی کتاب "دشتِ امکاں" اور اسی نوعیت کی دوسرے احباب ادب کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ اور آخر الذکر "شاعری اور علامتی اظہار" "انسانی رشتے، اور ہمارا عہد"، "مشرق کی بازیافت" "رینے گینوں کا تصور روایت اور عصر جدید"، "عہد جدید کا تصور انسان" اور دیگر مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ سارے کے سارے مضامین نہ صرف سوچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی سوچنے کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

جمال پانی پتی صاحب کا خیال ہے کہ شخصی و ذاتی علامت ابہام کا شاخسانہ ہے اور غیر شخصی تصورِ علامت ادب کو گہرائی اور گیرائی فراہم کرتی ہے گویا وہ دوسرے لفظوں میں اجتماعی تصور علامت یا معاشرے سے حاصل کردہ علامت کو لائق اعتنا سمجھتے ہیں بیدل عظیم آبادی نے اپنی تصنیف غالباً "چہار عنصر" میں بڑی اچھی بات کہی ہے وہ یہ کہ جس تصور کو بادی النظر میں اندرون کا عطیہ سمجھا جاتا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو اُس میں بھی کہیں نہ کہیں باہر یا خارج موجود ہے۔

"شاعری اور علامتی اظہار" میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "روایتی تہذیبوں کے غیر شخصی تصورِ علامت کے برعکس عہدِ حاضر میں ہر شخص کی جدید شاعری کی علامتیں ذاتی ہوتی ہیں، جن کا سمجھنا دوسروں کے لیے اکثر و بیشتر دشوار ہوتا ہے۔ صاحب مضمون کا یہ موقف ایک حد تک درست ہے، لیکن یہ بھی بجا ہے کہ نئے نظامِ شعر کو اگر اپنے دور کا عکاس ہونا ہے تو پھر وہ اس دور کے علامتی عناصر سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں پرانی اشیا کی تفہیم نئے نظام کے مطابق کرنی ہوگی۔ فیض احمد فیض اس کی ایک واضح مثال ہیں جنھوں نے گل و بلبل اور از ایں قبیل الفاظ کو نیا سیاسی مفہوم و تناظر دیا۔ الفاظ وہی رہے لیکن اُن کی علامت و معنویت یکسر بدل گئی۔ نئے زمانے سے آنکھ ملانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تہذیبی رشتے کو بھی استوار رکھا جائے عصری حسیت کے حوالے سے تازہ دم بھی کہلایا جائے اور خاص و عام میں قبولیت بھی بڑھ چڑھ کر ہو۔ لہٰذا نئی نسل پر کوئی بندھا ٹکا کلیہ تھوپنے کی بجائے اُن پر دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ کیونکہ شخصی تجربہ بھی باہر سے اثر انداز ہوئے بغیر اپنی کوئی صورت مرتب نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ بھی بہ عنوانِ دگر ایک طرح سے غیر شخصی نظامِ شعر کا حصہ ہے۔

"مشرق کی بازیافت" کے حوالے سے یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ سے بہت پہلے مغرب و مشرق کی "خدا مرکز" روایت INTACT تھی۔ اور "خدا مرکزیت" مشرق و مغرب کا یکساں ملجیٰ و ماوا تھی، لیکن چودھویں صدی عیسوی سے مغرب "خدا مرکز" معاشرے سے گریزاں نظر آتا ہے۔ فرانسیسی مستشرق رینے گینوں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مغرب کی "خدا مرکز" گریزی ہی، اس کے بہت سے اندرونی فساد کا سبب ہے۔ اس کے برعکس مشرق کی خدا مرکزیت ہنوز برقرار ہے چنانچہ رینے گینوں مشرق کی طرف بڑی پُر اُمیدی سے دیکھتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ "ادب اور روایت" میں بیشتر مضامین سوچنے پر اکساتے ہیں، یہ اکساہٹ اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر موضوع سے خاطر خواہ بحث کی جائے لیکن تبصرے کے صفحات کی تنگ دامانی کے سبب اس کی گنجائش کم ہے اس لیے اختصار ملحوظ رکھے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا میں اپنی بات کو یہیں ختم کرتا ہوں، اس سے آگے کی بہت سی باتوں کو جاننے کے لیے "ادب اور روایت" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(ا - ل)

سیپ ناولٹ نمبر شمارہ ۶۶

مدیر نسیم درانی

صفحات ۳۲۲ قیمت =/۳۰ روپے

سیپ پبلی کیشنز۔ کراچی پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴

سیپ کے اجرا کو ۳۲ برس ہونے کو آئے تب سے آج تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ اِس کا ہر شمارہ خاص نمبر کا درجہ رکھتا ہے اُردو کے ادبی حلقوں میں یہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، اپنی پہچان آپ ہے۔

سیپ کا زیرِ بحث شمارہ ناولٹ نمبر ہے۔ اس سے پہلے بھی اس کا ایک بہت ہی وقیع ناولٹ نمبر شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

سیپ کے اس شمارے میں پہلے نمبر پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا غیر مطبوعہ ناولٹ "سہراب" شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کو برسوں ہو گئے اِس طرح اس ناولٹ کا شمار نوادر میں کیا جانا چاہیے اِس کے علاوہ حفیظ احسن کا ناولٹ "پورٹریٹ کی تکمیل" ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا ناولٹ"، "پشتہا پُشت زہر پھوٹے گی"، امراؤ طارق کے زیرِ تصنیف ناولٹ "عینا تُم کے ترا ہے پر تامار کا ایک حصہ، محمد سعید شیخ کا ناولٹ "اقبال کا جرم"، ام عمارہ کا مختصر ناولٹ "یہ گزرے دنوں کا قصہ ہے" بلراج ورما کا ناولٹ "کابوس" ڈاکٹر انور نسیم کا ناولٹ "رہ خزاں میں تلاشِ بہار" اور ضمیر الدین احمد کے ناول "پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی" کا ایک باب (جو اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گا۔) کی شمولیت سیپ کے اس نمبر کو وقیع بنا رہی ہے۔

اِن ناولٹوں پر فرداً فرداً گفتگو کا یہاں موقع نہیں، اس نمبر میں شامل اہلِ قلم تمام پڑھنے والوں کے لیے جانے پہچانے ہیں، ۳۲۲ صفحات پر مشتمل اس مجلّے کی قیمت ۳۲ روپے رکھی گئی ہے جو اس میں شامل مواد کو دیکھتے ہوئے بہت ہی کم ہے۔ ہوشربا گرانی کا سیپ کی دیرینہ روایت یعنی کم سے کم قیمت رکھنے پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ پرچے کی ترتیب و آرائش میں سابقہ سیپ کا صوری و معنوی حسن برقرار رہے۔

(ا-س)

فنون

سہ ماہی، شمارہ جنوری، اپریل ۱۹۹۴ء

مدیر احمد ندیم قاسمی

صفحات ۳۵۳ قیمت =/۷۵ روپے

۴۵۔ اے۔ مزنگ روڈ لاہور۔

فنون کو جاری ہوئے بھی ۳۲ برس ہو گئے۔ یوں تو اس کے سبھی شمارے خاص نمبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا ایک کارنامہ اس کا ضخیم "غزل نمبر ہے" جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس مجلّے کا آغاز اللہ کی تعریف یعنی حمد سے ہوتا ہے پھر بہت سی اچھی نعتوں کے ذریعے مدحتِ رسولؐ کا حق ادا کیا گیا ہے۔

مقالات کے حصّے کے لیے محمد کاظم، دیوندر اسر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، شاہین مفتی، پرتو روہیلہ اور لالہ رُخ نے لکھے ہیں۔

"دریا باد کے مزاج دار مولانا" میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی شخصیت کے بہت سے اچھوتے گوشے شامل ہیں۔ محمد کاظم کا اسلوب لُطف دے گیا ہے۔

فن اور فنکار کا حصّہ بھی وقیع ہے۔ اس میں ادا جعفری، قمر اجنالوی، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قیصر تمکین اور نیلم احمد بشیر کے فن و شخصیت پر مختلف اہلِ قلم نے روشنی ڈالی ہے۔

نظموں، افسانوں، اور غزلوں کا حصہ بدستور وقیع ہے۔ تقریباً سارے جانے پہچانے نام شامل ہیں۔ بنگلہ دیش کی نمائندگی غلام محمد کے افسانے "کرسٹل" اور زین العابدین کے افسانے "بگولا" سے ہوا ہے۔

علاوہ ازیں فنون لطیفہ، سفر نامہ، انشائیہ، طنز و مزاح پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ کتابوں پر تبصرے اور احباب کے خطوط مزید تنوعات پیدا کرتے ہیں۔ غرضیکہ فنون کی روایت تمام و کمال قائم ہے۔

اوراق سالنامہ

(شمارہ فروری، مارچ ۱۹۹۵ء)

مدیران: وزیر آغا، سجاد نقوی

صفحات ۴۷۲ قیمت =/۸۰ روپے

دفتر اوراق ۳/۱۱۵ سرور روڈ، لاہور چھاؤنی

اُردو ادب میں اوراق کی پہچان مستحکم ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر شمارہ کئی اعتبار سے منفرد ہے معروف شاعر رشید نثار کا ایک وقیع گوشہ شامل ہے۔ اس کے لیے غلام الثقلین، جمیل آذر، انجم نیازی، زاہد حسین چغتائی اور نجمی صدیقی نے لکھا ہے، جن سے رشید نثار کی شخصیت و فن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

حسبِ سابق ادب کی تمام اصناف، ہائیکو، دوہے، ماہیے، یاد نگاری، نظمیں، مقالات، غزلیں، افسانے تجزیاتی مطالعے، انشائیے، نثر لطیف، مزاح، بازگشت، اور "اس کتاب میں" کے تحت کتابوں پر تبصرہ اور آپس کی باتیں کے تحت خطوط شامل ہیں۔

"پہلا ورق"، "روس میں ٹوٹ پھوٹ" پر سنبھلی ہوئی کیفیات کے ساتھ نہ صرف ایک اچھا مطالعہ ہے بلکہ THOUGHT PROVOKING بھی ہے۔

نظم کے حصے میں سینئر اور جونیئر نظم نگار شانہ بشانہ دیکھے جاتے ہیں لیکن غزل میں یہ ترتیب بدل گئی ہے۔ اور یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اس میں عمر کا لحاظ بھی رکھا گیا، اور یہ بہ اعتبار اسلوب بھی مرتب ہوا ہے۔

"نثر لطیف" کی شمولیت اوراق کا اختصاص ہے اِس عنوان کے تحت عرف عام میں نثری نظمیں شامل کی گئی ہیں انشائیہ کا ایک بھاری بھرکم حصّہ بدستور موجود ہے۔ مختصر یہ کہ اوراق کا یہ شمارہ اپنی روایتی ترتیب و تدوین کے عین مطابق ہے۔ اور قاری کو دعوتِ مطالعہ دیتا ہے۔

اس میں بعض بڑے اچھے مقالات شامل ہیں ریاض صدیقی کا مقالہ اُردو تنقید۔ نو تاریخیت اور سلیم آغا قزلباش کا مقالہ "رُجحان اور تحریک" پر مغز ہے۔

سہ ماہی ادبیات

مدیر اعلیٰ: خالد اقبال یاسر

صفحات ۱۲۵۶ قیمت =/۱۶۰ روپے

اکادمی ادبیات پاکستان سیکٹر ایچ ۸/۱ اسلام آباد

سہ ماہی "ادبیات" کا مشترکہ شمارہ (۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰) اسلام آباد میں ادیبوں اور دانشوروں کی سہ روزہ کانفرنس ۱۹۹۴ء کے انعقاد کے موقع پر پیش کیا گیا یہ پرچہ ۱۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۳۶، ادیبوں اور شاعروں کی نمائندہ تخلیقات شامل ہیں۔ جو نثر و نظم کی تقریباً تمام اصناف کا احاطہ کرتی ہیں، اس ضخیم مجلے میں جن تخلیق کاروں کی شمولیت ہوئی ہے، اُن کی تخلیقات پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ تخلیقات کا ایک ہجوم ہے۔ ہر ایک کا مطالبہ ہے کہ اسے پڑھا جائے ان مطالبوں کے درمیان تبصرہ نگار سر بہ زانو ہے، پڑھنا تو درکنار! پھر اتنے بہت سے صفحات کو جستہ جستہ پڑھنے کے لیے کافی وقت بھی درکار ہے، اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ ایک انار صد بیمار۔ لہذا مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ذہن بہ یک وقت اُردو ادب کے جن نمائندہ ادیبوں کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ اُن میں سے بیش تر کی اس گراں قدر مجلے میں شمولیت ہو گئی ہے۔ یہ مجلہ اکادمی ادبیات پاکستان کے جانب سے ادیبوں دانشوروں اور اُن کے پڑھنے والوں کے لیے ایک بیش بہا تحفے کی حیثیت رکھتا ہے اس کی صوری و معنوی خوبیوں کے متعلق اتنا کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان سے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے جرائد کے ضخیم نمبروں کے تسلسل میں یہ ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ جو ادیبوں اور دانشوروں کی کانفرنس ۹۴ء کی تادیر یاد دلاتا رہے گا۔

اس مجلے کی ترتیب و تدوین کا کام بہت صبر آزما تھا۔ جس سے اس کے فاضل مدیران بہ احسن عہدہ برآ ہوئے ہیں، ضخامت کے اعتبار سے اس کی قیمت کچھ زیادہ نہیں۔ مسرت مرزا نے موقع کی مناسبت سے "ادبیات" کا سرورق تیار کیا ہے جو نگاہ کو بھاتا ہے۔

(ا۔ س)

دلی مرحوم کی ایک جھلک

مصنف: نصیر دہلوی

صفحات ۲۰۸ قیمت =/۵۰ روپے

ناشر: مجید پبلیکیشنز ۵ ای، کمرشل ایریا، ناظم آباد کراچی

حقیقی ادب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ نصیر دہلوی کے یہ افسانے آج سے پچاس ساٹھ برس قبل کی دہلی کی اس طرز معاشرت اور تہذیب کو پیش کرتے ہیں جس کی جھلکیاں دیکھنے کو اب آنکھیں خود دہلی میں ترستی ہیں۔

نصیر امام کے یہ تمام افسانے مختلف الخیال ہیں جن میں کچھ المیہ عنصر کی نمائندگی کرتے ہیں اور کچھ میں طربیہ انداز کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر افسانوں کے کردار پلاٹ واقعات میں کافی رنگارنگی ہے جس سے ان افسانوں میں تنوع دکھائی دیتا ہے۔ ان افسانوں کے سلسلہ میں ملا واحدی دہلوی لکھتے ہیں "نصیر میاں پروردگارِ عالم نے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ راشد الخیری کی روح تم میں پھونک دی ہے۔ علامہ کی تحریر کا یہ امتیاز بدرجۂ اُتم تمھاری تحریر میں موجود ہے حتیٰ کہ غمناکی بھی......

ان افسانوں کے ضمن میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے دہلی جیسی مرکزی جگہ پر بیٹھ کر ٹھیٹ ٹکسالی زبان اور روز مرہ کے بامحاورہ الفاظ کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے

ان افسانوں کی زبان و بیان کے بارے میں خواجہ محمد شفیع دہلوی رقمطراز ہیں کہ "نصیر امام ریختی کے بادشاہ ہیں، محاورے روز مرہ کی لونڈی کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں......

"بدحواس خانم" "ماں کی مامتا"، "بن ماں کی بچی"، "بیگم کی عید"، "آفت کی پرکالہ" میں دہلی کی زبان اور معاشرتی زندگی کو بڑے فطری انداز میں برتا گیا ہے۔ افسانہ "بیگم کی عید" کے سلسلہ میں رسالہ "حریت" دہلی کے مدیر لکھتے ہیں کہ افسانہ دہلی کے مسلمانوں کی روز مرہ کی زندگی کا آئینہ دار ہے ...... نصیر دہلوی المناک مضامین ہی میں حضرت علامہ راشد الخیری کے حقیقی جانشین نہیں ہیں بلکہ مزاحیہ مضامین میں بھی انھوں نے حضرت علامہ کی جگہ سنبھال لی ہے۔"

یہ افسانے منادی، حریت، فطرت، ادیب، مشور، شاہکار، فنکار، وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔

آج کے تبدیل شدہ ماحول اور وقت کے بدلے ہوئے منظر نامہ میں ممکن ہے ان افسانوں کی اہمیت اور افادیت باقی نہ رہی ہو مگر ان کی تاریخی اہمیت اور حیثیت سے انکار ممکن نہیں، ان افسانوں کے پلاٹ، کردار فضا ممکن ہے آج غیر مانوس سی لگتی ہو۔ مگر ان کے ذریعہ ایک تباہ شدہ معاشرہ اور ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی کچھ جھلکیاں ضرور نظروں کے سامنے آجاتی ہیں یہی اس افسانوی مجموعے کی بہت بڑی افادیت ہے۔

(شہاب قدوائی)

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ اس کتاب پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں	ایہام کی تحریک	اصلاحِ زبان کی تحریک
علی گڑھ تحریک	فورٹ ولیم کالج	انجمن پنجاب کی تحریک
رومانوی تحریک	ترقی پسند تحریک	حلقۂ اربابِ ذوق
اقبال کی تحریک	اسلامی ادب کی تحریک	ارضی ثقافتی تحریک

قیمت: ۔/۱۵۰ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی۔ ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

پریم چند... حیاتِ نو...... مانک ٹالہ

منشی پریم چند پر مانک ٹالہ نے ایک نئی کتاب محولہ بالا عنوان سے لکھی ہے۔ پریم چند پر یہ ان کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے قبل "پریم چند اور تصانیفِ پریم چند" اور "پریم چند کچھ نئے مباحث" چھپ کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، سید خالد محمود، رام لعل نابھوی، ڈاکٹر محمد حسن، مجیب الاسلام، ڈاکٹر گوئنکا، تاراچرن رستوگی، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر قمر رئیس اور متعدد دوسرے ممتاز ادبا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ متذکرہ بالا دو کتابوں کی اشاعت کے بعد مانک ٹالہ صاحب کا خیال تھا کہ ایک دفعہ پھر وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کی طرف لوٹ آئیں گے۔ افسانے اور مضامین لکھیں گے۔ لیکن برصغیر کے ممتاز محقق مشفق خواجہ صاحب نے انھیں وہ راہ چھوڑنے نہ دی جس پر وہ اپنی سابقہ دو کتابوں پر چل رہے تھے۔ انھوں نے پہلے تحسینِ سخن شناس کا فریضہ ادا کیا اور لکھا:

"ایسی عالمانہ کتاب (پریم چند کچھ نئے مباحث) لکھنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پریم چند کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں ہی کو آپ نے دور نہیں کیا، بہت سی نئی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ "پریم چند شناسی" کے سلسلے میں یہ کتاب سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

اور اس کے بعد مشفق خواجہ نے جو تقاضا کیا زیر نظر کتاب کو اس تقاضے ہی کا ثمر قرار دینا چاہیے۔

اُنھوں نے لکھا:

"دو کتابوں کی اشاعت کے بعد، اب آپ کو پریم چند کی مکمل سوانح عمری لکھنی چاہیے۔ پریم چند پر آپ کی نظر جتنی گہری ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ یہ کام کر ڈالیں۔"

جناب مانک ٹالہ کی زیرِ نظر کتاب دیکھ کر مجھے دو خوشیاں حاصل ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کتاب کی تحریک پاکستان سے ہوئی۔

دوسری یہ کہ مانک ٹالہ صاحب نے پریم چند کی ایک ایسی سوانح عمری مرتب کر دی جو ہر لحاظ سے جامع مبسوط ہے اور سابقہ

سوانح عمری اور پریم چند کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں کی تصحیح نگاری کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف سابقہ کام پر اپنی نظر رکھی بلکہ جہاں کہیں متنازعہ امور ابھرے مانک ٹالہ نے متعلقہ حضرات سے خط و کتابت کے ذریعے صراحت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ میں سوانحی کتاب کو کسی ایک شخص کی تحقیقی محنت کا ثمر اس وقت تک قرار نہیں دیتا جب تک کہ اس کی تکمیل اور مواد کی جستجو میں کتاب کے موضوع کے ماہرین محقق کی مدد اور اعانت نہ کریں۔ زیرِ نظر کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی تکمیل میں بھارت کے متعدد "پریم چند اسکالروں" نے مانک ٹالہ کی مدد کی اور واقعاتی اور زمانی لحاظ سے اس کتاب کے اعتبار میں اضافہ کیا۔

منشی پریم چند جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا ۳۱ جولائی ۱۸۸۵ھ کو ایک غیر معروف گاؤں ملہتی جو بنارس سے اعظم گڑھ جانے والی سڑک کے کنارے واقع ہے ایک کچے آبائی مکان میں پیدا ہوئے اور ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ کو بنارس میں وفات پا گئے۔ مانک ٹالہ نے لکھا ہے کہ جب ان کی لاش ارتھی پر رکھی گئی اور جنازہ مرگھٹ کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں ایک راہ چلتے شخص نے دوسرے سے پوچھا: "کے رہل"؟

دوسرے شخص نے جواب دیا "کوئی ماسٹر تھا"

لیکن اِس "دوسرے شخص" کو معلوم نہیں تھا کہ اس "ماسٹر آں جہانی" نے پورے اردو ادب کو منور کر دیا تھا۔ مانک ٹالہ صاحب اس کی زندگی کی تابانیوں کو ان کی وفات کے تقریباً ۵۵ برس کے بعد سمیٹ رہے تھے۔ ان کی کتابوں سے اس دور کا پورا معاشرہ اور منشی پریم چند کی زندگی منعکس ہو رہی تھی۔

مانک ٹالہ نے اس کتاب کو زمانی اعتبار سے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ ابتدائی بیس برس پر، وسطی حصّہ تیس برس (۱۹۰۱ تا ۱۹۳۵) کا عرصہ دس دس برس کے تین ٹکڑوں پر ...... اور آخری حصّہ دمِ واپسیں تک کے عرصے پر محیط ہے۔ مانک ٹالہ نے سوانحی واقعات کو روایتی انداز میں قلم بند کرنے کی بجائے پریم چند کی تخلیقی زندگی کے گرد و پیش میں دیکھنے کی سعی بھی کی ہے۔ مانک ٹالہ کو سوانحی معلومات جس حوالے سے بھی دستیاب ہوئی ہیں، انھیں سابق مؤلفین کے الفاظ میں انھوں نے مناسب مقام پر پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ امرت رائے کی کتاب "قلم کے سپاہی" شیورانی دیوی کی "پریم چند گھر میں" (ان دنوں اس کتاب کا ہندی سے اردو میں ترجمہ ممتاز افسانہ نگار حسن منظر ماہنامہ "افکار" میں پیش کر رہے ہیں اور مدن گوپال کی مرتبہ کتاب "پریم چند کے خطوط سے استفادہ ہی نہیں کیا گیا بلکہ یہ اصحاب کتاب میں بطور سوانح نگار خود بھی موجود نظر آتے ہیں۔ پریم چند اپنے افسانوں میں بعض مقامات پر "واحد متکلم" میں خود اپنا کردار پیش کرتے ہیں، مانک ٹالہ نے اس "آپ بیتی" سے معلومات اخذ کرنے اور اس سوانح کو بامعنی بنانے کی بھی سعی کی ہے۔ ان کا بنیادی موقف یہ ہے کہ کہانی کا "واحد متکلم" جب سچی کہانی بیان کرتا ہے تو وہ بہت سے واقعات کو نئے سانچے میں ڈھال کر انھیں نئے سرے سے مرتب کرتا اور کہانی کو مؤثر بناتا ہے۔ کبھی وہ مفلس کلرک ہوتا ہے۔ کبھی نخوت پسند حاکم لیکن ان سے مصنّف کا ذاتی کردار متعین نہیں کیا جاسکتا۔ مانک ٹالہ کی خوبی یہ ہے کہ جن مصنّفین (مثلاً مدن گوپال) نے اس قسم کے واقعات سے پریم چند کو ہدفِ ملامت بنانے کی کوشش کی۔ اِن کی وضاحت اس "حیاتِ نو" میں کر دی لیکن جہاں انھیں پریم چند کا حقیقی عکس نظر آیا اور پریم چند نے خود اپنی آپ بیتی پیش کی وہاں اس سے بھرپور فائدہ بھی اُٹھایا۔ اور کتاب کو پریم چند کی زندگی کا ایک ایسا مرقع بنا دیا جس میں صرف اس کی خوبیوں کو اجاگر نہیں کیا گیا بلکہ اِن کی بشری کمزوریوں کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب کی ایک جداگانہ حیثیت یہ ہے کہ اس میں پریم چند کی متعدد کہانیوں اور ان کے سب ناولوں کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پریم چند مکمل صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کتاب کو "پریم چند انسائیکلوپیڈیا" کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

میں مانک ٹالہ صاحب کی محنت اور ان کی پریم چند دوستی کی داد دیتا ہوں۔ مشفق خواجہ کے الفاظ میں انھوں نے لکھنے کا حق ادا کر دیا اور خوبی یہ کہ اپنی غیر جانبداری پر حرف بھی نہیں آنے دیا۔ بلاشبہ مانک ٹالہ پریم کے عقیدت مند ہیں لیکن وہ ان کے نقاد بھی ہیں اور مضبوط وکیل بھی انھوں نے اپنی ان تینوں حیثیتوں کا اثبات بڑی خوبی سے کرایا ہے۔ پریم گوپال متّل نے مانک ٹالہ پبلشنگ ہاؤس دہلی سے یہ کتاب خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔

دیدہ وشنیدہ (خود نوشت) / سیّد شہاب الدّین دسنوی

میری ناچیز رائے میں خود نوشت سوانح نگاری اپنی زندگی کو خود اپنے آئینے میں دیکھنے کی کاوش بھی ہے اور اس صداقت کو بازیافت کرنے کی سعی بھی جس کے تلخ یا شیریں تجربے سے مصنّف گزر چکا ہے۔ قاری کے لیے یہ ایک ایسی فلم کے مترادف ہے جو اس کے سامنے فلم ساز خود پیش کر رہا ہے۔ بعض لوگوں نے تصنیف و تالیف کے اس کام کو تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر قرار دیا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خود نوشت سوانح میں چونکہ گزرے ہوئے لمحوں کی عبارت دوبارہ مرتب کی جاتی ہے اس لیے اس میں قاری کی دلچسپی کے متعدد "افسانوی عناصر" تلاش کیے جاسکتے ہیں اور ان تجربات میں شرکت کا جاسکتی ہے جن کا ذائقہ مصنّف چکھ چکا ہے۔

سیّد شہاب الدّین دسنوی سے میرا تعارف غائبانہ ان کی تصنیف "شبلی (معاندانہ تنقید کی روشنی میں)" سے ہوا تھا۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ان کا ذکر ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر ابن فرید سے ایک مشترکہ ملاقات میں آیا تو یہ کتاب بھی زیر بحث آئی۔ چنانچہ میرے دل میں ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "نقوش میوات" کے مدیر شبیر احمد میواتی نے سیّد شہاب الدّین دسنوی کی خود نوشت سوانح "دیدہ وشنیدہ" میری اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہی تلاش کی اور اب یہ لکھتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے ان سے ایک طویل معلومات ہی نہیں کرلی بلکہ ان کی زندگی کے ساتھ ۱۳۵ صفحات کا خوش گوار سفر بھی طے کر لیا ہے۔

اس سفر میں انھوں نے میری انگلی ریاست بہار کے شہر بہار شریف کے گاؤں دسنہ سے پکڑی اور متعدد شخصیات علمی و ادبی اداروں اور ان گنت شہروں سے ملاقات کرانے کے بعد دلّی میں لاکر چھوڑ دیا کہ میں اپنے وطن لاہور آجاؤں سید شہاب الدّین مجھے جہاں جہاں لے گئے اس جگہ کا نقش میرے دل پر اسی طرح اترتا گیا جیسے یہ نقش خود انھوں نے اپنے دل پر اتارا تھا۔ اس سوانح عمری میں سیّد صاحب کی بنیادی حیثیت ایک زیرک ناظر کی ہے۔ منظر ان سے معانقہ کرتا ہے تو کھل اٹھتے ہیں، کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ منظر خود ان پر غالب آگیا ہے اور وہ منظر کے گردوپیش کے ناظر نہیں رہے بلکہ خود اس کا جزو بن گئے ہیں۔ شخصیات کے مطالعے میں انھوں نے بالخصوص یہ اہتمام کیا ہے کہ ایسی باتوں کو کتاب میں شامل کر دیں جن کا علم کم لوگوں کو ہوگا۔ اس ضمن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ۱۹۴۱ء میں ان کی ملاقات کو اہم قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں نہ صرف مسلمانوں کی جداگانہ

قومیت اور مسلم لیگ کے تعمیری پروگرام کے بارے میں قیام پاکستان سے چھ برس پہلے سوالات پوچھے گئے بلکہ قائد اعظم کے بارے میں بعض نادر مشاہدات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ کانجی دوار کا داس سے ان کے انٹرویو کا موضوع بھی قائدِ اعظم ہی ہیں اور اس سے محترمہ رکی بائی کے بارے میں بعض نادر باتیں سامنے آتی ہیں۔

سید شہاب الدین نے عملی زندگی کی ابتدا انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں ایک سائنس ٹیچر کی حیثیت میں کی لیکن ان کی زیادہ توجہ سماجی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی طرف رہی۔ چنانچہ انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) اور دار المصنفین اور متعدد علمی اور فلاحی اداروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھا اور متعدد سماجی اداروں میں بطور رکن مجلس انتظامیہ بھی خدمات سرانجام دیں مغربی ممالک کے سفر پر نکلے تو واپسی پر کراچی میں بھی رکے۔ کراچی میں وہ متعدد لوگوں سے ملے ہوں گے لیکن لطف اللہ خاں اور مشفق خواجہ نے جو نقش ان کے دل پر ثبت کیا وہ اس کتاب میں محفوظ ہو گیا ہے۔ میں اسے بھارت کی پاکستان کو تحسین شمار کرتا ہوں جو سیاستدانوں کو نصیب نہیں ہوتی۔

آپ بیتی میں مصنّف کو تعلی کے بہت سے مواقع حاصل ہوئے ہیں "دیدہ و شنیدہ" کی خوبی سمجھیے یہ ہے کہ اس میں حلم و انکسار نمایاں نظر آتا ہے۔ خود نمائی دبی دبی رہتی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

کھودو بابا کا مقبرہ...... جوگندر پال

اردو کے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال کے افسانوں کا نیا اور اشاعتی ترتیب سے بارھواں مجموعہ "کھودو بابا کا مقبرہ" موصول ہوا تو مجھے وہ افسانہ بہت اچھا لگا جو انھوں نے "خود وفاتیہ" کے عنوان سے لکھا ہے اور کتاب کے آخر میں شامل کیا ہے۔ یہ افسانہ نہیں، حقیقت ہے بظاہر، جوگندر پال کی آپ بیتی ہے لیکن یہ اس انداز میں لکھی گئی ہے جیسے وہ اپنی وفات کے بعد خود اپنی تعریف لکھ رہے ہیں۔ اور خوبی یہ کہ "خود وفاتیہ جسے آپ خود نوشت تعزیتی کالم بھی قرار دے سکتے ہیں، محض بیتی ہوئی زندگی کے واقعات کی سرگزشت نہیں بلکہ یہ اس زندگی کا تذکرہ ہے جو فن کے ساتھ بسر کی گئی ہے۔ اس سے ایک ایسا افسانہ نگار سامنے آتا ہے جس نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں کاٹی، کائنات کے لیے بسر کی اور اس کی ہر کروٹ کو افسانے کا روپ دینے کی کاوش کی۔ انھیں احساس ہے کہ

> "میرے ساتھ جو اور جیسے بیتی وہ میرے مرے مرے ہی بیت گئی، اس لیے اپنا وفات نگار آپ ہی بنتے ہوئے مجھے کسی لے دے کا سامنا نہیں"

مجھے جوگندر پال کے ساتھ متعدد مرتبہ رہنے اور مسلسل چند ایام اکٹھے گزارنے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ ایک ایسے غیر دنیادار انسان ہیں جو بازار حیات سے گزرنے اور سب کچھ دیکھنے اور سامنے نظر آنے والی حقیقت کی عدم صداقت اور آلودگی کو محسوس کرنے کے باوجود اپنے افسانوں کی دنیا سے باہر نہیں آئے۔ اس قسم کے مقامات پر وہ اپنے وجود میں نظر نہیں آتے لیکن جب بغیر وقفہ ڈالے مسلسل دھواں چھوڑنے لگتے اور اپنی کرسی چادر اوڑھ کر چپ سادھ لیتے ہیں۔ اور زبان تالو سے لگا کر سوچنے لگتے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے ذہن میں خلفشار بپا ہے اور ان کے کسی نئے افسانے کے واقعات اور کردار انھیں کچوکے مار رہے ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب یہ افسانہ کاغذ پر اتر آتا ہے تو جوگندر پال شانت نظر آتے ہیں لیکن شانتی کا یہ لمحہ زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ بہت جلد کوئی واقعہ خلفشار

پیدا کر دیتا ہے۔ جوگندر پال پھر اپنی چُپ کی سمادھی میں گم ہو جاتے ہیں، واپس آتے ہیں تو پھر ایک سماجی صحیفہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مجھے بہت سے افسانہ نگاروں سے ان کی خلوت میں بیٹھ کر باتیں کرنے اور ان کے تخلیقی عمل کا مشاہدہ کرنے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں لیکن ایسے افسانہ نگار کم کم نظر آئے جن کا مقصد محض کہانیاں بیان کرنا نہ ہو۔ بلکہ کہانی لکھ کر اپنے اندر کے آتش فشاں کو سرد کرنا ہو یا افسانے کے کرداروں کے ہجوم میں اپنی شناخت گم کر دینا ہو۔ متعدد افسانہ نگاروں کی شخصیتیں کاٹھی، جامد اور پتھر کی طرح سخت ہیں۔ جوگندر پال کی شخصیت سیّال ہے اور یہ ہر فسانے میں نہ صرف موجود ہوتی ہے بلکہ اپنا روپ بھی افسانے کی صورتِ واقعہ اور ماحول کے مطابق تبدیل کر لیتی ہے۔

یہ چند باتیں "کھودو بابا کا مقبرہ" کے افسانے پڑھ کر میرے ذہن میں نہیں آئیں یہ آہستہ آہستہ طویل عرصے میں مرتب ہوئی ہیں۔ میں جوگندر پال کے قریباً سب افسانے پڑھ چکا ہوں۔ بعض افسانوں پر تو مجھے ان کے ساتھ رو برو بحث کا موقعہ بھی ملا ہے۔ ان کے افسانے اگرچہ زندگی کا "فوٹو گرافک" عکس نہیں، افسانہ نگار نے انھیں ایک ماہر مصوّر کی طرح تخلیقی روپ دیا ہے۔ لیکن یہ زندگی کے اتنے قریب اور حقیقت کا ایسا روپ ہیں جو ہمیں کائنات میں ہر طرف بکھرا ہوا نظر آتا ہے جوگندر پال کی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانہ لکھ کر خلفشار کو مجسم بھی کرتے ہیں اور پھر اس میں اپنے قاری کو بھی شامل کر لیتے ہیں وہ یوں کہ خلفشار اس کے بطون میں بھی منتقل کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے افسانہ "گرین ہاؤس" کا "مولو" جب چاند کی طرف بڑھتے بڑھتے زمین پر آ گرتا ہے اور مکمل موت کے بعد دوبارہ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اور اپنا جنم پھر پرانی کائنات ہی میں تلاش کرتا ہے تو کیا یہ آج کی حقیقت نہیں۔ "مولو" کے روپ میں میری اور آپ کی زندگی کا المیہ پیش نہیں کیا گیا؟ "فاختائیں" کا موجد سنگھ جس کی جان سیالکوٹ کے گاؤں چونڈے میں اڑی ہوئی ہے۔ اپنے بھائی وریام سنگھ کو سہارن پور میں چھوڑ کر خود چونڈے کیوں پہنچ جاتا ہے۔ اور دیکھیے اس خواب سے کیسا المیہ منظر ابھرا ہے:

"یہ چونڈے کا پرائمری اسکول ہے۔ اسکول کے سامنے یہ کچا راستہ ہے جو سیدھا اس کے گھر کو جاتا ہے وہ...... وہاں اس کے گھر کی چوکھٹ پر دھرم کور کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اپنی بیماری میں بھی وہ اسی طرح ہر روز اس کی واپسی پر یہیں کھڑی ہوتی ہے...... وہ اسے جی بھر کر دیکھنے کے لیے رک گیا ہے۔ اسے لگ رہا ہے کہ میری جنانی سرسوں کے زرد پھولوں کی طرح سونا سونا بکھری پڑی ہے۔ اس پر ایک ٹک نظر باندھے وہ یکبارگی اچھل پڑا ہے۔ کہ میں لو بھی یہاں اسے للچائی ہوئی آنکھوں سے تکے جا رہا ہوں اور وہ وہاں بخار سے دھواں دھوار، سلگ رہی ہے...... وہ لپک کر اس کی جانب ہو لیتا ہے۔ پر آدھے فاصلے پر ہی دیکھتا ہے کہ وہ مسکراتے مسکراتے زمین پر ڈھیر ہو گئی ہے......"

"نہیں رحمٰن بابو۔ "بکریاں"، "مہاجر"، "نردھن"، "زوال"، "گنگا رام" جیسے افسانوں میں جوگندر پال نے کہانی کہنے یا واقعات کو افسانہ بنانے میں کسی مخصوص آزمودہ اور پختہ ٹیکنیک کو استعمال نہیں کیا۔ یہ افسانے الہامی صورت بھی نہیں رکھتے۔ یہ تو ہمارے معاشرے کی چند قاشیں ہیں جو ہم تک جوگندر پال کے بطون سے پہنچتی ہیں۔ ان کی ساخت فطری ہے ان کی منطق خودرو ہے۔ ان کہانیوں کا نام جوگندر پال ہے لیکن میں ان کہانیوں کو انور سدید بھی کہہ سکتا ہوں۔

یہ کتاب وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں میرا مطالعہ اور جوگندر پال کا افسانہ یکجان ہو جاتے ہیں۔ ہماری روٹی ختم ہو جاتی ہے یہ مقام امتیاز بہت کم افسانہ نگاروں کو ملا ہے۔

گردوپیش

جناب حکیم محمد سعید کے لیے "نشانِ سپاس"

انجمن ترقی اردو پاکستان نے محترم حکیم محمد سعید کی نصف صدی پر محیط علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نیپا سماعت گاہ، گلشن اقبال کراچی میں ایک پُروقار تقریب منعقد کی، جس کی صدارت انجمن کے صدر جناب نور الحسن جعفری نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض جناب امراؤ طارق نائب معتمد اعزازی انجمن نے انجام دیے۔ تلاوتِ کلام ربانی کی سعادت جناب شاہ مصباح الدین شکیل نے حاصل کی۔ افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے جناب جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن نے کہا کہ حکیم صاحب محترم کی شخصیت، شہرت اور اُن کی صفات کے گوناگوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے جس شایانِ شان طریقے سے اس تقریب کا اہتمام ہونا چاہیے تھا وہ تو ممکن نہ ہو سکا مگر اس "جھونپڑے" میں ہم اُن کو یہ استقبالیہ دے رہیں جو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کا ادنیٰ سا اظہار ہے۔ ان کی اپنی کتابوں کی تعداد کا خود مجھے بھی علم نہیں۔ مگر اُن کی ادبی کتابوں کی تعداد انگلی کے پوروں کے حساب سے اٹھائیس سے بھی زیادہ ہے انھوں نے کہا ضرورت اس بات کی ہے کہ حکیم صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ملک کے دوسرے صوبوں کے تعاون سے شایانِ شان طور پر سیمینار منعقد کیا جائے۔ ہم اُن پر دو روزہ سیمینار کے انعقاد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس شہر قائد کا فرض ہے کہ دنیا کہ اسٹیج پر حکیم صاحب کی خدمات کو اُجاگر کرے۔ عالی صاحب نے اپنے مخصوص دردمندانہ لہجے میں کہا ہم اپنے بڑے لوگوں کو وہ مقام نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ اپنے لوگوں کو پہچاننا سیکھیے تاکہ لوگ آپ کو بھی پہچانیں۔

جناب مختار زمن نے حکیم صاحب کا نہایت دلچسپ اور معلوماتی شخصی خاکہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا ان کی شخصیت "تین ح" کا مجموعہ ہے حافظ، حکیم، حاجی یعنی حافظ حاجی حکیم محمد سعید۔ حکیم صاحب کے نزدیک نسب و خاندان پر بے جا تفاخر قابلِ ترک چیز ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ پاکستان نے ہمیں کیا دیا بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم نے اور آپ نے پاکستان کو کیا دیا۔ وہ پاکستان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اشتہارات کے ذریعہ شہریوں کو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ "پاکستان سے محبت کرو" اور "پاکستان کی تعمیر کرو۔" وہ محنت کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور آخری سانس تک کام کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین جانتے ہیں لازمی طور پر ایسا شخص دوسروں سے کام لینا بھی جانتا ہوگا۔

پروفیسر سحر انصاری نے اُن کے سفرناموں کے بارے میں ایک وقیع مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ حکیم صاحب نے دنیا کے تمام ممالک کا سفر کیا ہے اور نہایت معروضی انداز میں معلوماتی اور دلچسپ سفرنامے لکھے ہیں۔ انھوں نے "سعید سیاح" کے عنوان سے بچوں کے لیے طویل سفرنامہ لکھا ہے اُن کے سفرناموں کو دو حصے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک حصے میں معلومات فراہم کی گئی ہے اور دوسرے میں نجی تاثرات۔ وہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کے تعلیمی اداروں کو ضرور دیکھتے ہیں۔ اُن کے سفرنامے بہت مفید ہیں۔

جناب مسعود احمد برکاتی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب کا سب سے نمایاں پہلو حرکت ہے۔ اُن کا ذہن ہر قسم کے خیالات کے لیے شاہراہِ عام ہے پھر یہ خیالات منصوبوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اُن کے غور و فکر کی ایک اعتکافی مدت ہوتی ہے جس میں وہ گہری نظر سے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں ناقابلِ عمل کو رد کرتے ہیں۔ اور قابلِ عمل منصوبوں پر کام شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کو آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ وہ بچپن میں بڑے کھلنڈرے تھے مگر بعد میں بڑے محنتی اور مستعد ثابت ہوئے ہمدرد فاؤنڈیشن اور مدینتہ الحکمت کا قیام اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ آزادی کے بعد انھوں نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ مطب کو اُن کی زندگی میں اوّلیت حاصل ہے۔ طب کو جدید طریقۂ علاج تک لانے میں اُن کا بڑا حصہ ہے وہ وقت کی فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتے اور بہ یک وقت بہت سارے کام کرتے ہیں ان کو مشاہداتِ سفر نے کتب کے مطالعہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختصراً اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس "محفل سعید" میں اپنی شرکت کو میں باعثِ افتخار سمجھتا ہوں۔ محترم حکیم صاحب کی معرفت کراچی تمام دنیا میں جانا جاتا ہے وہ پاکستان کا ایک مستقل حوالہ ہیں وہ ہمارے شہر کا پرچم ہیں۔ وہ آدمیت کی ساری منزلوں سے گزر کر انسان کی منزل پر فائز ہو چکے ہیں۔ میں یہاں عالی صاحب کی باتوں کو دہرانا چاہتا ہوں اُن پر یہاں ایک بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری نے اُن کی خدمت میں انجمن ترقی اردو کا نشانِ سپاس پیش کیا۔ اور جناب جمیل الدین عالی نے پھولوں کا گلدستہ!

مہمانِ خصوصی حکیم محمد سعید نے انجمن ترقی اردو کے لیے تشکر کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ انجمن کو بلندیاں عطا کرے۔ اور پاکستان کی زبان ہر سطح پر اردو ہو جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم نے اہلِ علم اور صاحبانِ علم و حکمت کا احترام نہ کر کے پاکستان کو نقصان پہنچایا ہے۔ عظیم انسان وہ ہے جو بظاہر سمندر کی طرح پرسکون رہتا ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ انسان ہونا کتنا مشکل کام ہے۔ ہر انسان بادل نہیں کہ برس پڑے۔ پہاڑ نہیں کہ غموں سے پھٹ پڑے۔ اور پھول نہیں کہ غموں سے مرجھا جائے۔ میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے آخر آپ کس اُمید پر حکیم سعید کو انعام دے رہے ہیں۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جسے اپنے دل اور زبان پر قابو ہوتا ہے۔ میں اپنی زبان پر قابو رکھوں اور آپ اپنے دل پر جعفری صاحب اور عالی صاحب! الحمد للہ!

صدر محفل اور صدر انجمن محترم نور الحسن جعفری نے کہا کراچی آج ایک اداس شہر ہے حکیم صاحب ہر ماہ شام ہمدرد منعقد کر کے اس شہر کو روشن کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمارا اعتبار بڑھایا ہے۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ ۳۳ برس پہلے والے حکیم صاحب کی مسکراہٹ اور نرم لہجہ برقرار ہے وہ اپنا بیشتر وقت فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں ان کے جذبۂ خدمت کے مختلف مظاہر ہیں ان کو دیکھ کر انسانیت پر اعتبار قائم ہو جاتا ہے۔ اس بارہ کروڑ کے شہر میں اگر دس آدمی ایسے ہی ہوتے تو اس ملک کی قسمت بدل جاتی۔

محترمہ جیلانی بانو اور ڈاکٹر انور معظم کی انجمن میں آمد

۱۱/ مارچ ۹۵ء کو اُردو کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو اور اُن کے شوہر جناب ڈاکٹر انور معظم انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تشریف لائے۔ انجمن کی روایت رہی ہے کہ جب کوئی ادیب باہر سے کراچی آتا ہے تو اُسے یہاں مدعو کیا جاتا ہے اس کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام ہوتا ہے اور اُس سے ادب کے حوالے سے تبادلۂ خیال کا موقع نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ تبادلۂ خیال کے آغاز سے پہلے جناب امراؤ طارق (نائب معتمد اعزازی انجمن) نے مہمانانِ گرامی کا تعارف کرایا اور اُن کی آمد پر خوش آمدید کہا۔ جناب شہزاد منظر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے محترمہ جیلانی بانو سے دریافت کیا کہ سنا ہے کہ آپ نے کوئی تازہ ناول لکھنا شروع کیا ہے۔ اِس کا نام کیا

ہے، کچھ اس کے بارے میں بتائیں جیلانی بانو نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرا نیا ناول جو ابھی لکھا جارہا ہے اس کا نام "خاموش فلم کی ہیروئن" ہوگا۔ اس کا موضوع عورت ہے، سوچنے والی اور بولنے والی عورت لیکن مشکل یہ ہے کہ سوچنے والی اور بولنے والی عورت معاشرے میں مشکل سے قبول کی جاتی ہے۔

جناب شہاب قدوائی کے اس سوال پر کہ آپ کے بعد کی نسل میں کون کون نئے افسانہ نگار منظر عام پر آئے ہیں۔ جیلانی بانو نے کہا کہ محمد اشرف، انور خان، اور علی امام نقوی اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔ کچھ اور نام بھی ہیں جو فوری یاد نہیں آرہے ہیں۔

اس سوال کا کہ بابری مسجد کے واقعے کو ہندوستان کے ادیبوں نے موضوع بنایا ہے کہ نہیں مہمان افسانہ نگار جیلانی بانو نے جواب دیا کہ جوگندر پال، حسین الحق اور ذکیہ مشہدی نے اس موضوع پر بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مستقبل میں اس پر مزید افسانے لکھے جائیں گے۔

جناب شبیہ عباس جارچوئی کے اس سوال کے جواب میں کہ ہندوستان میں اُردو افسانے کے دیگر زبانوں میں تراجم کی کیا رفتار ہے؟ محترمہ جیلانی بانو نے بتایا کہ اُردو کے افسانوں کے وہاں کی دیگر زبانوں میں ترجمے ہوتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے انکشاف کیا کہ اُن کا ناول "ایوانِ غزل" چودہ زبانوں میں ترجمہ ہورہا ہے محترمہ جیلانی بانو نے مزید کہا کہ ہمارے ہاں "آدان پردان کے تحت نہ صرف ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کا کام خاصا ہورہا ہے۔ بلکہ مختلف زبانوں کے ادبا شعرا گاہے گاہے تبادلۂ خیال کے لیے مل بیٹھتے ہیں۔ ایک لمحہ رک کر انھوں نے پوچھا، کچھ آپ بھی اپنے ہاں کی ادبی صورتِ حال پر روشنی ڈالیں۔

اس کے جواب میں محترمہ زاہدہ حنا نے کہا، مختلف زبانوں کے ادیبوں کے مل بیٹھنے کا سلسلہ کراچی میں تو کم کم ہے، لیکن کراچی سے باہر، حیدر آباد، سکھر وغیرہ میں سندھی اُردو ادیبوں کے مل بیٹھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

جناب نظر کامرانی نے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ افسانوں کی حد تک ہمارے ہاں دوسری زبانوں سے تراجم کم و بیش یہاں کے تمام رسائل شائع کرتے رہتے ہیں، افکار نے ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری رکھا قومی زبان میں تو ہر ماہ علاقائی افسانے اور نظمیں پابندی سے ترجمے کی صورت میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

جناب امراؤ طارق نے جیلانی بانو کے اس سوال سے، کہ کراچی کے موجودہ حالات پر افسانے لکھے جارہے ہیں سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات پر ابھی افسانے نہیں لکھے جارہے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم اس تماشے کا ایک حصّہ ہیں اور ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ایک "کوما" کی حالت میں بسر کررہے ہیں۔ جب تک اِس صورتِ حال سے نکل نہیں جاتے خاطر خواہ نہیں لکھ سکتے۔

سرشار صدیقی نے کہا کہ شاعری ہو یا افسانہ جب تک موضوع اِس کے لہو کا حصّہ نہیں بنتا، اچھی تخلیق ممکن نہیں، یہ موضوع جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے ہمارے لہو کا حصہ بن نہیں پایا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے طور پر اکادکا لوگ اس موضوع پر قلم اٹھارہے ہیں، ایسی تحریریں تاریخ کا حصّہ ہیں کہیں نہ کہیں ریکارڈ ہورہی ہیں۔ اگرچہ تحریریں ہنگامی ہوتی ہیں لیکن ہنگامی ادب کی بھی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔

جیلانی بانو نے کہا کہ لکھنے کے عمل میں کسی بھی ادیب یا شاعر سے یہ استفسار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے فلاں موضوع پر لکھا کہ نہیں۔ بعض اوقات بڑے سے بڑا واقعہ ایک ادیب و شاعر کو متاثر نہیں کرپاتا، مگر ایک چھوٹا سا واقعہ اس سے اچھے افسانے لکھوالیتا ہے۔

اردو کی ترویج کے حوالے سے ڈاکٹر انور معظم نے بتایا کہ حیدر آباد (دکن) میں "عابد علی خاں اردو ٹرسٹ" اُردو سکھانے کے سلسلے میں رضا کارانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ عوام میں اس کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی ہے، خواتین اور بچوں نے ہی نہیں سن رسیدہ لوگوں نے بھی اُردو کی تعلیم کے حصول میں دلچسپی دکھلائی ہے۔ "عابد علی خاں اُردو ٹرسٹ" کو مثال بنا کر اُردو اکادمی نے بھی دلی اور اس کے نواح میں اردو سکھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ علاوہ ازیں حیدر آباد (دکن) کے کرسچن اِسکول میں بھی اُردو پڑھانے کا انتظام ہے۔

جناب نظر کامرانی نے محترمہ جیلانی بانو سے ہندوستانی ادبی ایوارڈ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے کہا۔ اس پر محترمہ نے تفصیل سے گیان پٹ، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور اقبال سمان کے بارے میں بتایا ساتھ ہی انھوں نے پاکستان میں دیے جانے والے ادبی ایوارڈ کا حال احوال دریافت کیا۔ جواب میں سرشار صدیقی نے کہا کہ اس کا جواب عالی صاحب بہتر طور پر دے سکیں گے۔ جنھوں نے ایوارڈ کی ابتداء ہی رائٹرز گلڈ سے کی۔

جناب جمیل الدّین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے بڑی تفصیل سے پاکستان کے ادبی ایوارڈ کے اجرا کی کہانی بیان کی۔ ان کے بیان کے مطابق پاکستان میں ادبی ایوارڈ کا آغاز ان کی تحریک پر ہوا جب وہ رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری تھے۔ ان کی مساعی سے پہلے پہل آدم جی ادبی ایوارڈ (تخلیق ادب کے لیے) دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد ازاں داؤد ادبی ایوارڈ پھر حبیب بینک ایوارڈ (علاقائی ادب کے لیے) اور پھر یونائیٹڈ بینک ایوارڈ (بچوں کے ادب کے لیے) کا اجرا ہوا۔

اِس موقع پر عالی صاحب نے اُن سرکاری اعزازات و انعامات کا ذکر بھی کیا جو ادبی و ثقافتی نوعیت کے گراں قدر کام کرنے کے لیے ادیبوں، شاعروں اور فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں کے فنکاروں کو ہر سال دیے جاتے ہیں ساتھ ہی اُنھوں نے اکادمی کی طرف سے دیے جانے والے ہجرہ ایوارڈ اور سیرت ایوارڈ کا بھی ذکر کیا۔

عالی صاحب کی ان ہی گفتگوؤں کے ساتھ نشست اختتام پذیر ہوئی اور مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔

اس نشست میں مہمان گرامی کے ساتھ شہر کے جن دوسرے ادبا نے شرکت کی اُن میں محترمہ زاہدہ حنا، محترمہ شکیلہ رفیق محترمہ جاوداں منہاس، محترمہ ریحانہ روحی، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر عتیق احمد، پروفیسر سحر انصاری، جناب سرشار صدیقی، ڈاکٹر عبد الروف پاریکھ، جناب منظر علی خاں منظر، جناب جاوید قیصر، جناب طارق سرشار، جناب افتخار رومی، اور جناب میر حسین علی امام کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نظیر صدیقی اور اُمِ عمارہ کے اعزاز میں

گزشتہ دنوں فکشن گروپ کے زیرِ اہتمام نارتھ ناظم آباد میں دو نامور ادبی شخصیات کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں پروفیسر نظیر صدیقی کو الوداع کہا گیا۔ اور معروف افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ اُمِ عمارہ کا استقبال کیا گیا۔ واضح رہے کہ پروفیسر نظیر صدیقی جو گزشتہ کئی برسوں سے کراچی میں مقیم تھے چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اسلام آباد منتقل ہو گئے ہیں۔ جبکہ اُمِ عمارہ جو ایبٹ آباد میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ مختصر دورہ پر کراچی تشریف لائی تھیں۔ صدارت مظہر جمیل نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب علی حیدر ملک نے انجام دیے۔

دونوں کے ادبی نظریات کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو پہلے پروفیسر نظیر صدیقی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی تنقیدی نظریہ بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ میں ساری زندگی اس تلاش میں رہا کہ میرا تنقیدی نظریہ کیا ہے۔ پھر یہ کہ میں نے اپنی تنقید کو فلسفیانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ جو کچھ میں نے سمجھا ہے اس کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اور یہ کہ اگر کسی نے زندگی کے بارے میں کوئی رویہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اُس شخص کے تخیل میں کتنی نُدرت ہے۔ جب تک انسان میں تخلیقی صلاحیت نہ ہو وہ تنقید بھی نہیں لکھ سکتا۔ میں تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھتا ہوں۔ تنقید میں ایک نظریہ دوسرے کو پس پشت ڈال دیتا ہے اگر نقاد نہ ہو تو فنکار کے درمیان کی خلیج کو عبور نہیں کیا جاسکتا۔ میں کلیم الدین احمد کی اس بات کو نہیں مانتا کہ اردو تنقید حالی سے آگے نہیں بڑھی۔

مجھے کلیم الدین احمد کے بیان میں فکری عظمت نظر نہیں آتی۔ جبکہ محمد حسن عسکری، اپنی علمیت کی بنا پر سلیم احمد سے برتر تھے۔ انھوں نے مزید کہا میرے پاس بنا بنایا فلسفہ نہیں ہے البتہ جب میں فکری بحث کرتا ہوں تو فلسفہ سے کام لیتا ہوں۔ اور فن کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب اُن سے (COLIN WILSON) کولن وِلسن کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سے تعلقات کی ابتداء اس بات سے ہوئی جب میں نے اُس کی پہلی کتاب THE OUT SIDER پڑھی اس مطالعے سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ تمام چیزوں سے واقف ہے۔ اس کی نظر میں انسان ایک بڑی تہذیب کا چھوٹا سا پُرزہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ولسن کو اقبال کے بارے میں توجہ دلائی تاکہ وہ اقبال کا مطالعہ کر کے اُن کے فکر پر کوئی رائے قائم کر سکے۔

(رپورٹ احمد زین الدین)

بزمِ نشور کا "نشانِ اعتراف"

گزشتہ دنوں بزمِ نشور کے زیر اہتمام "نیپا کی سماعت گاہ میں جناب اختر سکندروی، جناب قیصری کانپوری اور جناب اختر لکھنوی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب منعقد ہوئی، جس کی صدارت جناب قمر جمیل نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر قاسم پیرزادہ تھے۔ نظامت کے فرائض مسرت حسین زبیری نے انجام دیے اور تلاوتِ کلام پاک کی سعادت غفار شاد نے حاصل کی۔

پروفیسر آفاق صدیقی نے اپنے تعارفی کلمات میں "بزمِ نشور" کی تنظیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

جناب ہمایوں اختر نے کہا جناب اختر سکندروی گزشتہ چالیس برسوں سے شاعری کر رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کے اشعار میں کہیں کہیں غالب کے نظریۂ شعر کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے بعد کلام شاعر بہ زبان شاعر کے تحت جناب اختر سکندروی نے اپنا کلام سُنایا۔

پروفیسر جاذب قریشی نے کہا کہ قیصری کانپوری حضرت ناطق لکھنوی کے شاگرد ہیں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، وہ ہمارے عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں، جنھوں نے معاشرے کے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اس موقع پر جناب قیصری کانپوری نے چند قطعات اور غزل کے چند اشعار سُنائے۔

معروف شاعر اختر لکھنوی کی شخصیت اور شاعری پر جناب اظہر عباس ہاشمی نے ایک مختصر مگر جامع مضمون پڑھا۔ بعد ازاں اختر لکھنوی نے قطعات اور چند اشعار پیش کیے۔

جناب اسحاق ہاشمی اور جناب انیس الرحمن نے تینوں مہمان شعرا کی خدمت میں "نشانِ اعتراف" اور نقد ہدیۂ خلوص پیش کیے۔

مہمان خصوصی پیرزادہ قاسم نے کہا کہ شاعری میں یہ دیکھنے کی بات ہوتی ہے کہ کس شاعر نے کتنا سچ کہا ہے اور کس جرات سے کہا ہے آج کے مہمان شعراسچ کے پرستار ہیں اس جذبے کی تڑپ اُن کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ محبت کا جذبہ اب خدمت میں بدل رہا ہے، بزمِ نشور نے بلاشبہ ایک بڑا کام کیا ہے۔

صدر جلسہ جناب قمر جمیل نے کہا کہ اس موقع پر نئی باتیں کرنا مشکل ہے جناب نشور واحدی نے ہماری ذہنی تربیت کی، شاعروں کو غیور ہونا چاہیے ...... شاعری کا دکھ اٹھانا آسان کام نہیں۔

اِس سے پہلے "بزمِ نشور" کے سرپرست جناب حمید نور نے شرکا کی تشریف آوری پر خیر مقدمی کلمات کہے۔ ناظم تقریب مسرت حسین زبیری نے جناب افسر ماہ پوری کی ناگہانی وفات پر تعزیتی قرارداد پیش کی اور ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

رپورٹ "احمد زین الدین

اردو اور رسم الخط

جامعہ عثمانیہ کی اُردو خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے شکاگو میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں جناب ہاشم علی اختر صاحب نے جن کو ہندوستان کی دو بڑی جامعات۔ جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہنے کا اعزاز حاصل ہے، اپنے بہت ہی فکر انگیز خطبۂ صدارت میں اور باتوں کے علاوہ اُردو کے حوالے سے یہ بات بتائی کے گزشتہ چالیس برسوں میں اردو لکھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے لیکن اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح اردو اب "آنکھوں کی زبان" نہیں بلکہ "کانوں کی زبان" بن کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کی "بقا" کا مسئلہ ہے، پاکستان میں "ترقی" کا مسئلہ ہے اور مغرب میں "ترویج" کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ان حالات میں اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو ہم کو ہندوستان میں اردو کو زائد رسم الخط یعنی ہندی ادیوناگری میں اور مغرب میں اس کی ترویج کے لیے رومن رسم الخط میں بھی لکھنا ہوگا۔

یہ شروع ہی سے ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات و تجربات کی روشنی میں کیا اس پر غور مناسب ہوگا۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس لیے میں اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں تاکہ اردو کے خدمت گاروں کی رہنمائی ہو سکے۔

حسن چشتی
جنرل سکریٹری، بزمِ اردو
(شکاگو)

اقبال کی شاعری میں عالم اسلام کے مسائل کا حل پوشیدہ ہے

بنگلہ دیش میں علامہ اقبال کی شاعری اور اردو زبان کی ترقی کے لیے ماحول نہایت سازگار ہے۔ بنگلہ دیش کی پرانی نسل (جو پیدائش کے وقت پاکستانی تھی) علامہ اقبال کی شاعری سے پوری طرح آگاہ ہے علامہ اقبال کو بنگلہ دیش میں ملت اسلامیہ کے شاعر کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، ان خیالات کا اظہار بنگلہ دیش سے آئے ہوئے علامہ اقبال سوسائٹی کے سکریٹری جنرل ایم اے واحد نے نوائے وقت سے کیا انھوں نے علامہ اقبال سنگسد (سوسائٹی) بنگلہ دیش کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ علامہ اقبال سنگسد بنگلہ دیش کا اُبھرتا ہوا معروف ادارہ جو ۱۹۸۶ء میں شاعر مشرق مفکر علامہ اقبال کی یاد میں قائم کیا گیا۔ اسی ادارہ سے ملحق اقبال میموریل لائبریری قائم کی گئی ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کو عظیم فلسفی اور ملتِ اسلامیہ کا شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال

کسی ایک خطے یا ملک کے شاعر نہیں علامہ اقبال کو مقامی یا کسی خاص خطے کا شاعر کہنے والے کم عقل لوگ ہیں علامہ کا پیغام بین الاقوامی ہے اور یہ ساری امتِ اسلامیہ کے لیے ہے۔ بنگال کے مسلمان علامہ اقبال کو اپنا شاعر ان کے آفاقی پیغام کی وجہ سے مانتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کی شاعری میں ملت اسلامیہ کے مسائل کا حل ہے۔ اقبال کی سوچ میں جدت اسلام اور انقلاب ہے وہ مذہب کی اصلیت اور سیکولرازم کو سمجھتے ہوئے اصل اسلام کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ "علامہ اقبال سنگسد" کے قیام کا بنیادی مقصد علامہ اقبال کو بنگلہ دیشی نوجوان نسل سے متعارف کروانا ہے۔ ضرب کلیم کا بنگالی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور آئندہ پانچ برسوں تک علامہ اقبال کی تمام فارسی اور اردو شاعری کا ترجمہ بنگالی زبان میں مکمل کر لیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی ہر سال ۹ نومبر اور ۲۱ اپریل کو علامہ اقبال کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات پر قومی سطح پر سمینار منعقد کرواتی ہے۔ ان سمیناروں میں بنگلہ دیش کے دانشور، اعلیٰ عدالتوں کے جج وزراء مدیرانِ اخبارات، جامعات کے چانسلرز پروفیسرز اور پاکستان اور ایران کے سفارتکار شرکت کرتے ہیں۔ بنگالی اخبارات علامہ اقبال کے حوالے سے ہونے والی تقریبات کو صفحۂ اول پر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی نے قریباً پانچ ہزار صفحات بنگلہ زبان میں اقبالیات کے موضوع پر شائع کئے ہیں اور بنگلہ وانگریزی میں ایک سہ ماہی مجلّہ "علامہ اقبال سوسائٹی جرنل" کے نام سے بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور اقبال کی سوانح عمری اور منتخب کلام اقبال کی کتاب جلد شائع ہونے والی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش کے صحافی، علماءِ دین، شعراء، اساتذہ اور فلسفی حضرات کی بہت بڑی تعداد سوسائٹی سے منسلک ہے۔ سوسائٹی کے عہدیداروں کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ علامہ اقبال کی تمام تصانیف کا بنگلہ زبان میں ترجمہ جلد شائع کیا جائے اور اقبال میموریل لائبریری قومی سطح پر ایک شاندار اور جامع لائبریری بن جائے۔ سوسائٹی پاکستان سمیت دنیا بھر کے علم دوست حضرات سے بالعموم اور محبانِ اقبال سے بالخصوص کتابوں کے عطیے کی اپیل بھی کرتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی ڈھاکہ میں ایک انٹرنیشنل سمینار منعقد کروانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں دنیا کے جن ممالک میں بھی علامہ اقبال کے نام پر کوئی سوسائٹی یا ادارہ قائم ہے ان کے منتظمین اور ماہرین اقبالیات کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا بنگلہ دیش میں اردو زبان کی ترقی کے بہت امکانات ہیں۔ بنگلہ دیش میں اس وقت بھارتی لٹریچر اور اخبارات کی بھرمار ہے، بھارتی مواد کی کثرت سے بنگلہ دیش میں سیکولر سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش اسلامی بھائی چارے کے بندھن میں بندھے ہیں لہذا بنگلہ دیش میں اردو کی ترقی سے دونوں ممالک میں روابط کو مزید قریب کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے شعبے میں ایران سے مختلف اوقات میں اساتذہ پڑھانے کے لیے آتے ہیں جبکہ پاکستان سے کبھی بھی اردو کا کوئی پروفیسر پڑھانے نہیں آیا انھوں نے کہا کہ اردو زبان اور اقبال کے بنگلہ دیش میں عام ہونے سے اسلامی علوم کو بھی فروغ ملے گا۔ دوسری طرف عربی کے بعد اردو زبان میں اسلامی علوم اور اسلام پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے یوں اردو کے مقبول ہونے سے بنگالی لوگ اسلام کا وسیع مطالعہ کر سکیں گے۔

(روزنامہ نوائے وقت)

اقبالیات کے حوالے سے سمینار

علامہ اقبال سوسائٹی بنگلہ دیش ڈھاکہ میں اقبالیات کے حوالے سے ۷ نومبر ۱۹۹۵ء سے ۹ نومبر ۱۹۹۵ء تک ایک انٹرنیشنل سمینار منعقد کرا رہی ہے۔ یہ بات سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ایم اے واحد نے الاخبار کو بتائی انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال سوسائٹی بنگلہ دیش کا ایک ابھرتا ہوا معروف ادارہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی یاد میں قائم کیا گیا ہے پاکستان سے علیحدگی

کے بعد سے بنگلہ دیش کے ہمسایہ ملک نے اقبال کے کلام اور خیالات کو دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی مگر علامہ اقبال سوسائٹی کے بعد حالات بدل گئے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سوسائٹی نے تقریباً پانچ ہزار صفحات بنگالی زبان میں اقبالیات کے موضوع پر شائع کئے ہیں۔

(روزنامہ الاخبار اسلام آباد)

تقریب بہر ملاقات

"جلیسانِ ادب" حیدر آباد کی طرف سے، شعبۂ اردو جامعہ سندھ سے امسال ایم اے اردو کرنے والے طلبہ کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب معراج الدین نے مزاحیہ انداز میں تحریر کیا ہوا ایک خط پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ معروف مصور جناب غلام حسین صمدانی نے ادب اور آرٹ کے حوالے سے ایک معلوماتی اور فکر انگیز مقالہ پڑھا۔ جناب شمشیر قائم خانی نے "پروفیسر عنایت علی خاں کی مزاحیہ شاعری" کے عنوان سے اپنے طویل مضمون کی تلخیص سُنا کر داد حاصل کی۔ نثری حصے کا اختتام جناب مسرور احمد زئی کی دلچسپ فکاہیہ تحریر پر ہوا، جس میں ایم اے اردو کے تجربات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔ شعری دور میں کیڈٹ کالج پٹارو کے صدر شعبۂ اُردو جناب محمد انیس خان، میر پور خاص کے نوجوان شاعر جناب محمد علی منظر اور جناب عتیق احمد جیلانی نے اپنے تازہ اشعار سُنائے۔ دیگر شرکاء میں پروفیسر حبیب ارشد، پروفیسر انعام الحق عباسی، پروفیسر مرزا عاصی اختر، جناب شکیل احمد خاں، جناب صفدر علی خاں (نائب مدیر سہ ماہی "انشا" حیدر آباد)، جناب سید جاوید اقبال، جناب رشید احمد، جناب مسعود الرحمٰن، جناب ارشاد احمد اور جناب شکیل احمد زئی شامل ہیں۔ ہلکی پھلکی ضیافت پر نشست کا اختتام ہوا۔ جلیسانِ ادب کی طرف سے ایم اے اردو کے تمام مراحل بخیر و خوبی طے کرنے پر طلبہ کو مبارک باد پیش کی گئی۔

برصغیر کے نامور شاعر تلوک چند محروم کی ۲۹ ویں برسی

۵ فروری برصغیر کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کے اُنیسویں یوم وفات پر جموں میں محروم میموریل سوسائٹی نے ایک تقریب منعقد کی جس کی صدارت جموں کے سینئیر شاعر جناب عابد مناوری نے فرمائی۔ جنابِ محروم کی زندگی اور شاعری پر تین مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے "حیاتِ محروم" کا ایک باب پڑھا جس میں مرحوم شاعر کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر ان کی شاعری کے عروج تک کے کئی واقعات پر روشنی ڈالی گئی۔ ان کے بیان کا سحر اُس وقت قابلِ دید و داد ہوا جب نظم "نُور جہاں کا مزار" کے معرضِ تخلیق میں آنے یا اس کے روزنامہ "زمیندار" لاہور کے پہلے صفحے پر شائع ہونے، اور مولانا ظفر علی خاں کے لاہور کے ایک بڑے پبلک جلسے میں اپنی تقریر کے دوران میں اس نظم کے اشعار پڑھنے اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کر رہے تھے۔

اب خدا جانے محروم صاحب کی اس نظم کا اعجاز تھا یا مولانا ظفر علی خاں کی خطابت کا کرشمہ یا دونوں کا مشترکہ نتیجہ کہ "نُور جہاں کا مزار" جو ویرانے کی ایک تصویر تھا شاندار اور پُرشکوہ زیارت گاہ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور حکومتِ پاکستان نے مولانا ظفر علی خاں اور محروم صاحب کی آواز پر مزار کی تعمیر نو کے احکام جاری کر دیے۔

دوسرے مقالے کے لیے جناب اسد اللہ وانی صاحب کو ان کے مقالے "تلوک چند محروم "گنج معانی" کے آئینے میں" کے لیے دعوت دی۔ ان کا مضمون "گنج معانی" پر بھرپور اور سیر حاصل تبصرہ تھا۔ وانی صاحب نے محروم کی نظموں کے حوالے دیے، خاص طور پر محروم کی بیوی اور بیٹیوں شکنتلا اور ودیا کی وفات پر کہی ہوئی نظموں کے، اُن سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر ظہور الدین صدر شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی "تلوک چند محروم ، "فن اور شخصیت پڑھا"۔ محروم کی غزلیات سے جو اشعار ظہور صاحب نے پیش کیے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ محروم نظم کے نہیں غزل کے شاعر ہیں اور اتنے معیاری شعر کسی بھی غزل گو شاعر کے یہاں تلاش کرنا مشکل ہے۔

آخر میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں یسٰین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب، جوگندر پال طائر، ڈاکٹر طاہر ہارون مرزا، سریندر سرید، اور تسلیم منتظر نے اپنا کلام پیش کیا...... ڈاکٹر آر کے بھارتی نے جگن ناتھ آزاد کی نظم "واگہ کی سرحد پر" کا منظوم انگریزی ترجمہ سُنایا جس کے بعد جگن ناتھ آزاد نے اپنی اصل اُردو نظم پیش کی۔ تقریب میں مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ سروشری آنند لہر، راج کمار چندن، ڈاکٹر خورشید حمرا، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، مسز آزاد اور مسز بے تاب نے شرکت کی۔

جلسے کی ابتدا میں اُردو کی اُن بلند پایہ شخصیتوں کی یاد میں ماتمی روزولیوشن پاس کیا گیا جن کا انتقال حال ہی میں ہوا۔ اُن حضرات کے اسمائے گرامی ہیں۔

پروین شاکر، ظہیر کاشمیری، محمد عبد اللہ قریشی، حسن طاہر، جلیل ہاشمی، اختر حسین جعفری، محشر بدایونی، احمد داؤد، ممتاز حُسین (پاکستان) گیانی ذیل سنگھ، حسن واصف، شہاب سرمدی، وحید انور، محمد محبوب علی نصرت، اور پروفیسر سید ظہیر الدین مدنی (ہندوستان)

(راج کمار چندن)
اسسٹنٹ سیکرٹری (پبلسٹی)

انجمن جدید مصنفین پاکستان کا تعزیتی جلسہ

گزشتہ دنوں جناب افسر ماہ پوری کے انتقال پر انجمن جدید مصنفین پاکستان کراچی کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے میں مرحوم کے اچانک انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور فاتحہ خوانی کے بعد ایک قرار داد متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ قرار داد یہ تھی۔

"انجمن جدید مصنفین پاکستان کراچی کے اراکین اور شرکاء جلسہ اردو کے معروف بزرگ شاعر افسانہ نگار، نقاد اور کالم نگار افسر ماہ پوری کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں اور اسے اردو ادب کا ایک بڑا نقصان سمجھتے ہیں۔ اور ان کی پچاس سال سے زائد ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کے اعزا اور اقرباء کے غم میں شریک سمجھتے ہیں۔"

مولانا صلاح الدین احمد

مرتبہ: ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید

قیمت =/۱۲۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

عالمی سائنس وفنی شخصیات

سید قاسم محمود	بقراط، ارسطو ارشمیدس	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۹، ۱۲، ۱۸
سید قاسم محمود	بطلیموس، جالینوس، جابر بن حیان	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۲۱، ۲۳، ۲۸
سید قاسم محمود	ابو عثمان جاحظ، محمد بن موسیٰ خوارزمی......	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۳۲، ۳۵، ۳۷
سید قاسم محمود	الفارابی، ابوالقاسم الزہراوی ابن الہیثم	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۴۲، ۴۵، ۴۸
سید قاسم محمود	البیرونی، عمر خیام، ابن النفیس	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۵۶، ۵۵، ۵۸
سید قاسم محمود	سر آئزک نیوٹن، کارل لینس، جیمس واٹ	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۱۷
سید قاسم محمود	چارلس ڈارون، لارڈ ارنسٹ اور فورڈ......	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۴ء ص ۱۲۸، ۱۵۸، ۱۶۲

غالبیات

آصفہ نسیم	میر اور غالب کی عشقیہ شاعری کا تقابل	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۴ء ص ۴۳
آفتاب حسین سرائی	غالب کے تعزیت نامے	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۴ء
پرتو روہیلہ	غالب کے فارسی کلام کی تشریح	فنون، لاہور جنوری ۹۴ء ص ۵۳
اختر حسین رائے پوری ترجمہ: محمد رضا کاظمی	غالب ایک جائزہ	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۳۹
اسلم سروہی	عظمت غالب مصنفہ ڈاکٹر عبدالغنی	اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۴۰
افتخار احمد عدنی	غالب اور فرہاد	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۲۷
افتخار احمد عدنی	صبا اکبر آبادی کا ایک شعر غالب کی زمین میں	قومی زبان، کراچی جون ۹۴ء ص ۱۷
انور سدید، ڈاکٹر	عہد غالب کے چند مسائل	ماہ نو، لاہور فروری ۹۴ء ص ۷

ثاقبہ رحیم الدین	غالب کی ذہانت اور دورِ جدید	سیپ، کراچی سالنامہ ۹۲ء ص ۲۰۳
جمیل الدین عالی	حرفے چند، غالب اور انجمن ترقی اُردو کی خدمات	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۹
جمیل زبیری	عاشقِ غالب برجندر سیال، ایک باکمال فنکار	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۴۹
حبیب اللہ اوج	غالب اور سرسید	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۴ء ص ۵
حبیب اللہ اوج	مرزا غالب کے لطائف	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۴ء ص ۲۲
حنیف فوق، ڈاکٹر	غالب اور نقش نو آئین	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۱۳
رانا غلام شبیر	اسیر عابد کا منظوم ترجمہ "دیوان غالب" پنجابی میں	ماہ نو، فروری ۹۴ء ص ۲۴
رشید الدین	غالب کے کلام میں طنز کا پہلو	ادب لطیف، لاہور جنوری ۹۴ء ص ۱۹
رضوان احمد خاں	انجم شیخپوروی، شاگرد غالب	روحِ ادب، کلکتہ اکتوبر دسمبر ۹۳ء ص ۵۶
سجاد مرزا	پرتو غالب	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۴ء ص ۱۶
سجاد مرزا	غالب کے سات رنگ	ماہ نو، لاہور فروری ۹۴ء ص ۱۴
صبا اکبر آبادی	غالب، غالب	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۲۳
صدیقہ ارمان، ڈاکٹر	مکاتیب غالب اور ۱۸۵۷ء	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۴۹
طاہر علی زیدی	غالب کا تصورِ شک	ماہ نو، لاہور فروری ۹۴ء ص ۳۰
مجیب احمد، ڈاکٹر	یگانہ غالب اور غالب شکن	نگار، کراچی اپریل ۹۴ء ص ۵
معین الرحمٰن، ڈاکٹر	غالبیات ۱۹۹۰ - ۹۲ء	قومی زبان، کراچی فروری ۹۴ء ص ۴۳
والی آسی	مرزا غالب کے لطیفے	محفل، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۹۹
یگانہ چنگیزی	مکتوب یگانہ بنام سید مسعود حسن رضوی -----	نگار، کراچی اپریل ۹۴ء ص ۴۷

سرسید اور علی گڑھ تحریک

ابوالحسن علی ندوی، مولانا	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کام اور پیغام	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی جون ۹۴ء ص ۱۱
اظہر پرویز، ڈاکٹر	علی گڑھ سے علی گڑھ تک	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۳۸
حسن ضیاء	سرسید کا قوم کے سائنسی مزاج بنانے میں خاص حصہ	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۱۷
حیدر علی خاں	سرسید بحیثیت صحافی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۴ء ص ۲۳
خورشید الاسلام	سرراس مسعود	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۴ء ص ۸
خورشید احمد	علی گڑھ تحریک	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ۶ مارچ ۹۴ء ص ۴۹
ذوالفقار احمد	ہندی اخلاق اور علی گڑھ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۴ء ص ۱۲
سرسید احمد خاں	کن چیزوں میں تہذیب چاہیے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۴ء ص ۵
سرسید احمد خاں	حکایت، ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیادار کی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی جون ۹۴ء ص ۷
سرسید احمد خاں	اخلاق	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۴ء ص ۱۵
سید حامد	...... حکیم عبد الحمید ہندوستان میں، -----	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۴ء ص ۳۸
شیخ منظور الہی	آپ بیتی، جگ بیتی، شاہ ولی اللہ،	تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۹۴ء ص ۱۳

ضیاالدین لاہوری	مطالعہ سرسید، تضادات کے چند اہم پہلو	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۵۸
طالب ہاشمی	سرسید کی والدہ، عزیز النساء بیگم	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳۷
مصطفیٰ شیروانی	جان ڈیون پورٹ، سرسید کا ایک ہم عصر	تہذیب الاخلاق علی گڑھ جنوری ۹۴ء ص ۲۷
میر مختار	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قدیم آثار	تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۹۴ء ص ۸
نصر اللہ خاں عزیز	علی گڑھ کے نامور فرزند علی برادران کی والدہ	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۱۹

مرزا داغ دہلوی

بابائے اردو مولوی عبدالحق	(ا) نواب مرزا خاں داغ......	اردو، کراچی جنوری تا مارچ ۹۳ء ص ۹
داؤد رہبر، ڈاکٹر	داغ کی بیتی	اردو، کراچی جنوری تا مارچ ۹۳ء ص ۱۳
داؤد رہبر، ڈاکٹر	گلزارِ داغ کی سیر	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۴۵
داؤد رہبر، ڈاکٹر	آفتابِ داغ کی دھوپ	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۶۳
داؤد رہبر، ڈاکٹر	مہتابِ داغ کی چاندنی	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۷۷
داؤد رہبر، ڈاکٹر	داغ کے کلام میں حمد، نعت اور سلام	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۱۰۳
داؤد رہبر، ڈاکٹر	داغ کی نامہ نویسی	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۱۲۱
داؤد رہبر، ڈاکٹر	داغ کی سیرت	اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۳ء ص ۱۴۹

اقبالیات

آصف اقبال خان، ڈاکٹر	اقبال کا تصورِ مذہب	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۶۳
آنجہانی ہیرالال چوپڑا، ڈاکٹر	اقبال اور ہندوستان	انشا، کلکتہ جون ۹۴ء ص ۲۷
احمد جاوید	اقبال اور تصوف	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۱۰۲
اطہر قیوم راجہ	اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے اقبال کی فکر و عملی مساعی	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳۳
اقبال، علامہ	بنام عبداللہ چغتائی ۲۰ اپریل ۱۹۲۷ء	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۴۳۱
اقبال، علامہ	بنام سید نذیر نیازی ۱۱ دسمبر ۹۳ء	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۴۳۲
اقبال، علامہ	بنام سید نذیر نیازی ۱۹ اگست ۱۹۳۱ء	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۴۳۳
اقبال، علامہ	بنام شیخ محمد اکرام ۱۷ دسمبر ۱۹۳۳ء	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۴۳۷
بشریٰ خان	اقبال کا تصورِ وطنیت	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳۷
تحسین فراقی، ڈاکٹر	مثنوی چراغ دیر، ایک جائزہ	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۴۳
تحسین فراقی، ڈاکٹر	کلیات، مکاتیبِ اقبال، جلد سوم ایک جائزہ	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۳۹۴
جلال سوئیدان (ترک)	ترکی اقبالیات مرتبہ پروفیسر منور مسعود شیخ	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۹۷
حبیب اللہ اوج	اقبال اور فطرت نگاری	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳، ۴
حمید الدین شاہد	اقبال کا تصورِ خودی	سب رس، کراچی اپریل ۹۴ء ص ۵
خلیل اللہ خلیلی		
ترجمہ ببرک لودھی	سحرِ از یار آشنا سخن آشنا بگو، بحوالہ علامہ اقبال	نیرنگِ خیال، راولپنڈی مارچ ۹۴ء ص ۱۳

رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر	پیام مشرق کی عالمگیر مقبولیت	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۸۵
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	نقد اقبال حیات اقبال میں /ڈاکٹر تحسین فراقی	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۹۱
رفیع الدین ہاشمی	اقبال اور مظلومیِ نسواں	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۴ء ص ۱۵
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	اقبالیات کے تین سال، ۱۹۸۷ء۔۱۹۸۹ء	سیارہ، لاہور سالنامہ فروری ۹۴ء ص ۳۵۷
ریاض حسین، پروفیسر	اقبال کا ایک غیر مطبوعہ سہرا	اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۱
زاہد منیر عامر	علامہ اقبال کی تاریخ ولادت، ایک دستاویز۔۔۔۔۔۔	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۲۱
زیب النساء	کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ایک جائزہ	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۷۶
سلیم اختر، ڈاکٹر	حکمتِ قرآن اور علامہ اقبال	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۴
سمیع اللہ قریشی، پروفیسر	فکرِ اقبال میں سائنس کا مقام، قسط دوم	صحیفہ، لاہور اپریل جون ۹۳ء ص ۱۸
شفیق عجمی	فکرِ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۴۷
صدیق جاوید، ڈاکٹر	اقبال کا پہلا علمی مضمون، ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۹۹
صمد انصاری، ڈاکٹر	وجود فطرتِ انسانی نہ روح ہے نہ بدن	صریر، کراچی اپریل ۹۴ء ص ۱۸
ظفر اقبال راؤ	افکارِ اقبال کا پس منظر	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۰
عبدالقیوم، پروفیسر	اقبال کا تصورِ ختم نبوت	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۷
عنایت اللہ نسیم سوہدروی، پروفیسر	علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۴
عنایت اللہ نسیم سوہدروی، پروفیسر	اقبال کا تصور خودی	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۲۳
غلام رسول ازہر	علامہ اقبال کا ایک بھولا بسرا نیازمند۔۔۔۔۔۔	اقبال، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۴۷
قاضی عبدالغفار	علامہ اقبال کا نظریۂ بے خودی	ادب لطیف، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳۶
گلشن پروین	اقبال کا مرد مومن	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۹
محمد انور صادق، پروفیسر	اقبال کی شاعری میں آئینے کا مفہوم	اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۱۳
محمد انور صادق، پروفیسر	اقبال کا تصورِ آدم	اقبالیات، لاہور جنوری مارچ ۹۳ء ص ۲۷
محمد عبداللہ قریشی	اقبال کا ایک خط پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۳۶
محمد ریاض، ڈاکٹر	علامہ اقبال اور احترام عورت	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۲۵
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	اقبال کا تصورِ سپاہی	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۴ء ص ۸
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	تحریکِ آزادی میں علامہ اقبال کا کردار	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۱۸
معین الدین عقیل، ڈاکٹر	مصنف اقبال اور سرگزشت الفاظ احمد دین ا۔۔۔۔۔	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۴ء ص ۲۰
نزہت نیاز	علامہ اقبال کا تصورِ فقر و قلندری	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۴ء ص ۲۹
یوسف حسن	اقبال اور جاگیرداری	فنون، لاہور جولائی دسمبر ۹۳ء ص ۱۰۷

مولانا حسرت موہانی

اثر لکھنوی	حسرت موہانی کی شاعری	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۷
حبیب اللہ اوج	مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۳

سلمان	ایک تاریخی مضمون مطبوعہ اپریل ۱۹۵۸ء	نگار، کراچی مئی ۹۴ء ص ۷۷
عارف ہسوی، مولانا	دیوانِ حسرت	نگار، کراچی مئی ۹۴ء ص ۲۶
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	حسرت موہانی کے اولین سوانح نگار	نگار، کراچی مئی ۹۴ء ص ۵
نسیم سوہدروی، پروفیسر	درویش منش رئیس الاحرار، مولانا حسرت موہانی	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۴ء ص ۴

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

اظہر عباس ہاشمی	ہم یتیم ہوگئے	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۴۴
ایس آئی علی، پروفیسر	مقصد کے لیے مسلسل جدوجہد	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۱۹
ایم ایم عارف	ڈاکٹر صدیقی کے ساتھ ایک شام	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۶۷
بیناشاہین صدیق، ڈاکٹر	سلیم الزماں صدیقی	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۵۶
جمال نقوی، انجینئر	دیدہ ور	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۷۹
ذاکر علی خاں	ڈاکٹر صاحب امر ہوگئے	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۳۷
ذکریا ساجدہ، پروفیسر	علم کا بحیر ذخار	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۲۱
راشدہ نثار	کرنوں کے جال ٹوٹ گئے	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۵۲
شاہین فیضی	ایک حسین دور ختم ہوا	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۶۲
شریف المجاہد، پروفیسر	وسعتِ نظر اور فکر کی گہرائی	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۱۷
صابرہ بیگم، ڈاکٹر	وہ یہیں موجود ہیں	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۶۴
طارق محمود	شہرت اور دولت سے بے نیاز	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۴۹
عبدالرؤف نوشہروی، پروفیسر	ایک عظیم سائنس داں ایک عظیم انسان	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۴۷
عبدالنعیم خاں گردش	چند آنسو اور	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۷۰
عطاء الرحمن، ڈاکٹر	وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۲۴
مسعود عالم رضوی	کام کرنے کا لازوال جذبہ	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۴۲
معین الدین صدیقی	ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، سائنس دان محقق، آرٹسٹ	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۴ء ص ۴۸
مقصود عالم	سکریٹری نہیں شاگرد	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۷۳
نسیم ایم ترمذی، ڈاکٹر	جی چاہتا تھا باتیں کرتے رہیں	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۳۹
وقار الدین احمد، ڈاکٹر	کیا کیا یاد کریں	سائنس ڈائجسٹ، کراچی سالنامہ جون ۹۴ء ص ۳۴

مضمون صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھیں

انجمن ترقی اردو پاکستان کی تازہ ترین مطبوعات

1.	مشاہیر یونان وروما (جلد پنجم)	پلوٹارک	سید ہاشمی فرید آبادی	110/=
2.	مرقع اقوال وامثال		یوسف بخاری دہلوی	450/=
3.	جدید اُردو شاعری (حصہ دوم)		عزیز حامد مدنی	175/=
4.	زبان واحد	میرین مالٹینو	صفیہ صدیقی	100/=
5.	چینی لوک کہانیاں		شفیع عقیل	100/=
6.	سیف الملوک		شفیع عقیل	150/=
7.	پنجابی کے پانچ قدیم شاعر		شفیع عقیل	90/=
8.	بیاضِ مراثی		افسر صدیقی امروہوی	75/=
9.	اُردو تنقید کا ارتقا		ڈاکٹر عبادت بریلوی	150/=
10.	وضع اصطلاحات		مولوی وحید الدین سلیم	110/=

انجمن ترقی اُردو پاکستان

ڈی 159۔ بلاک 7۔ گلشن اقبال کراچی۔ 75300

جوامع الحکایات ولوامع الروایات

مترجمہ: اختر شیرانی

قیمت حصہ اوّل = /۷۰ روپے حصہ دوم = /۹۵

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال، کراچی

مطبوعات انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت حصّہ اوّل =/۱۰۰ روپے حصّہ دوم =/۱۲۵ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

چراغِ شناسائی

معروف ترک شاعر فواد باپرام اور غلو کی رباعیوں کا منظوم اُردو ترجمہ

مرتبہ: ڈاکٹر حنیف فوق

قیمت =/۳۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان

ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷ گلشن اقبال کراچی

ایران بہ عہد ساسانیاں

مصنّف: پروفیسر آرتھر کرسٹن سین

مترجم: ڈاکٹر محمد اقبال

قیمت =/۲۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

Regd M. No. 270 Phone: 461406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

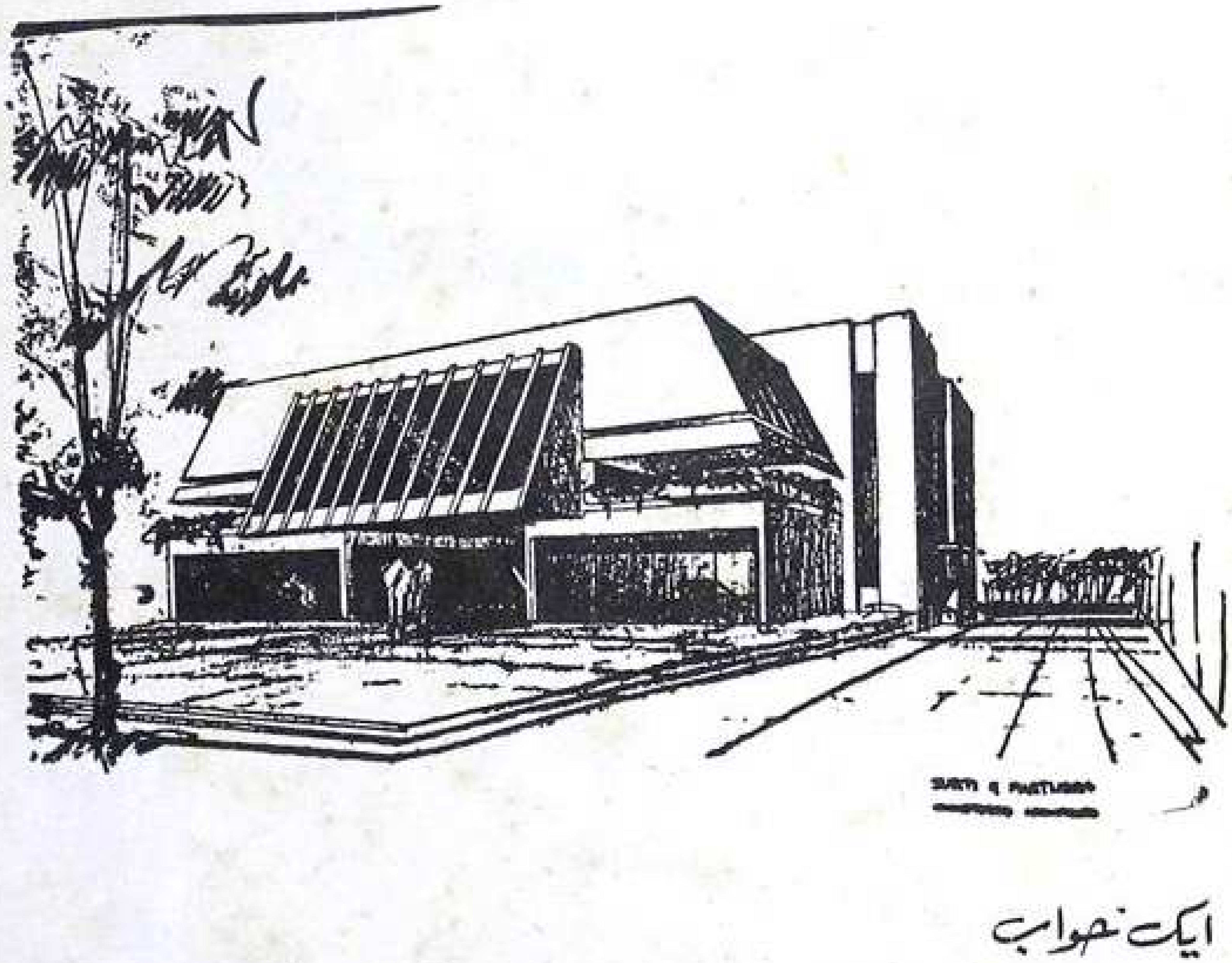

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: فضلی اینڈ سنز کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی